بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان ایک متاع گراں بہا تھی جو ہمیں فطرت کی طرف سے بطور نعمت ملی۔ لیکن ہم نے اس نعمت کی سخت ناقدری کی اور اپنی قوم کو جہنم کی کارواں سرائے میں آن اتارا۔ اب اس جہنم میں کبھی ہم مرنے والوں کو کوستے ہیں کہ انہوں نے فلاں غلطی کی اور فلاں فیصلہ صحیح نہ کیا جس کی وجہ سے ہم اس عذاب میں مبتلا ہیں اور کبھی عوام لیڈروں کو کوستے ہیں اور لیڈر عوام میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ یہ کچھ کرنے کے بعد ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ ہم مطمئن ہو جاتے ہیں اور جہنم کے شعلے دن بدن بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے اور اگر ہے تو اسے عمل میں لانے کا طریق کیا ہے؟

جب آپ پاکستان کے موجودہ معاشرے پر نگاہ ڈالیں گے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ اس میں کوئی خاص پرزہ خراب نہیں جس کے بدلنے سے معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی۔ یہ خرابی اس پورے نظام (Social Order) کی ہے جو یہاں کارفرما ہے۔ اس لئے ہمارے معاشرے کی اصلاح کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ یہاں موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ قرآنی نظام متشکل کیا جائے۔ قرآنی نظام کی تفاصیل تو طول طویل ہیں۔ لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ''ذمہ داری'' کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ یعنی وہ نظام یہ کہہ کر فریب نہیں دے سکتا کہ ہم اس کے لئے کوشش کریں گے۔ وہ اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اگر اس نظام میں کوئی ایک فرد بھی بھوکا رہ جائے یا اسے سامانِ نشوونما میسر نہ آئے تو وہ قرآنی نظام نہیں کہلا سکے گا۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، ضروری ہوگا کہ ملک کے تمام ذرائع پیداوار کا نظم ونسق خود اس نظام کے ہاتھوں میں ہو اور فاضلہ دولت (Surplus Money) کسی جگہ بھی جمع نہ ہونے پائے۔ یہ قرآنی نظام کی بنیادی خصوصیات ہوں گی۔ قرآن اس کے لئے جذبۂ محرکہ یہ بتاتا ہے کہ انسانی ذات (انا۔ خودی۔ نفس۔ ایغو Personality) کی نشوونما ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد کسی دوسرے کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ جب انسانی ذات کی نشوونما اس طرح ہو جائے تو وہ حیاتِ جاوید حاصل کر لیتی ہے اور اس طرح وہ مرنے کے بعد زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

یہ تو ہوا مقصد۔ یعنی موجودہ نظام کی جگہ قرآنی نظام کا قیام۔ اب سوال یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ اس مقصد کے حصول کا

طریقہ کیا ہوگا۔یعنی پاکستان میں اس قسم کا نظام کس طرح قائم ہوگا؟ پاکستان ایک آئینی مملکت ہے۔اس لئے اس میں ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام لانے کا طریق بھی آئینی ہی ہوگا۔آئینی تبدیلی کے معنی یہ ہیں کہ ملک کی مجالسِ قانون ساز میں اکثریت ان لوگوں کی ہو جو اس قسم کے نظام کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہوں۔یہ بھی ظاہر ہے کہ ملک کی ان مجالس قانون ساز میں اکثریت ان لوگوں کی ہو جو اس قسم کے نظام کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہوں۔یہ بھی ظاہر ہے کہ ملک کی ان مجالس میں (وہ مرکزی ہوں یا صوبائی) اراکین انتخاب کے ذریعہ آتے ہیں۔اوران انتخابات میں آراء (Votes) کی اکثریت عوام کی ہوتی ہے۔حالات کے اس تجزیے سے آپ نے دیکھ لیا کہ اس امر کا بنیادی اختیار عوام کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ملک میں کس قسم کا نظام قائم کریں۔لہٰذا عوام کا ان لوگوں کو موردِ الزام قرار دینا جو پہلے کسی قسم کا نظام قائم کر گئے ہوں یا اپنے لیڈروں کو کوسنا کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں اپنے اختیارات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

لیکن کہا یہ جائے گا کہ عوام بچارے جاہل ہیں۔ان کا سیاسی شعور بیدار نہیں۔وہ صحیح اور غلط نظام کو سمجھ نہیں سکتے۔وہ اچھے برے نمائندے میں تمیز نہیں کر سکتے۔وہ اس قدر غریب اور مفلس ہیں کہ روٹی کا دھندا انہیں کسی دوسری طرف توجہ ہی نہیں کرنے دیتا۔معاشی مجبوریوں نے انہیں اس قدر رکچل دیا ہے کہ انہیں ملک کے آئینی اور سیاسی معاملات میں دلچسپی ہی نہیں رہی۔نیز جیسا کہ قرآن نے خود کہا ہے کہ مفاد پرست گروہ اس قسم کی سازشیں اور تدبیریں کرتا رہتا ہے جن سے عوام کا شعور بیدار ہی نہ ہو۔تو اب کیا جائے تو کیا کیا جائے؟

یہ ظاہر ہے کہ جب تک آپ کے ہاں جمہوری نظام ہے اس وقت تک عوام کے تعاون کے بغیر کوئی آئینی انقلاب رونما ہو نہیں سکتا لہٰذا عوام میں صحیح نگاہوں کا پیدا کرنا معاشرہ کی اصلاح کے لئے لاینفک ہے۔اس کے بغیر آپ قیامت تک بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہ کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ عوام میں صحیح نگاہ پیدا نہ ہو سکے۔لہٰذا عوام میں صحیح نگاہ پیدا کرنے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے جو

(i) خود قرآنی نظام سے واقف ہوں اور اس کے قیام کے لئے مضطرب و بے قرار ہوں۔اور

(ii) جن کے سامنے اپنا مفاد کوئی نہ ہو۔

پاکستان میں قرآنی نظامِ ربوبیت کی نشاندہی طلوع اسلام نے کرائی ہے۔اس لئے وہی طبقہ اس نظام سے اچھی طرح باخبر ہے جو طلوع اسلام اور اس کے شائع کردہ لٹریچر کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار چکا ہے۔ہمارے پاس ایسا باور (بلکہ یقین) کرنے کے لئے کافی شواہد موجود ہیں کہ ملک میں اس قسم کے حضرات کی اب کمی نہیں۔نیز اس امر کی بھی کہ ان کے دلوں میں اس نظام کی تشکیل کے لئے بڑی تڑپ ہے اور ان کے سامنے اپنا کوئی مفاد نہیں۔حتیٰ کہ نام اور نمود کی بھی خواہش نہیں۔وہ ملک کے ایسے دور دراز گوشوں میں جن

کے نام تک سے بھی باہر کی دنیا کم واقف ہے' نہایت خاموشی سے اس قرآنی فکر کو آگے بڑھانے میں مصروف رہتے ہیں اور اس میں جس قدر تکالیف سامنے آتی ہیں انہیں نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ طبقہ جس پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ عوام میں ایسی صحیح نگاہ پیدا کریں۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ ملک کے ایک ایک فرد کو نظامِ ربوبیت سے آشنا کرایا جائے۔ یہ کام ذاتی بات چیت سے بھی ہوگا اور لٹریچر کی تقسیم سے بھی۔ طلوع اسلام کی طرف سے جو کچھ اس وقت تک شائع ہو چکا ہے وہ اس نظام سے متعارف کرانے کے لئے بہت کافی ہے (اس میں مزید اضافہ بھی بدستور اور مسلسل ہوتا رہتا ہے) ضرورت اس کی ہے کہ اس لٹریچر کو گھر گھر پہنچایا جائے۔ اس کا ترجمہ علاقائی زبانوں میں کیا جائے۔ پھر اسے ذاتی طور پر مختلف کونوں اور گوشوں میں پہنچایا جائے۔ نجی ملاقاتوں میں اس کے متعلق گفتگو کی جائے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ آپ کو اس کی دھن لگ جائے۔ آپ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ اپنے مکان پر ہوں یا کسی دوسرے کے۔ شادی کی تقریب میں ہوں یا غمی کی۔ مسجد میں ہوں یا مدرسہ میں۔ آپ کسی جگہ اور کسی مقام پر ہوں' یہی نقطہ آپ کا موضوعِ گفتگو ہو۔ یعنی قرآنی نظامِ ربوبیت کا تعارف۔ اور اس ابتدائی تعارف کے بعد جب آپ سننے والوں میں کچھ دلچسپی دیکھیں تو ان تک ضروری لٹریچر پہنچایا جائے۔ اور اس تمام جدوجہد اور سعی و کاوش سے آپ کا ذاتی مفاد کوئی بھی پیش نظر نہ ہو۔ آپ کا قول و فعل۔ سیرت و کردار اس عظیم حقیقت کا اعلان ہو کہ **ما اسئلکم علیه من اجر۔ ان اجری الا علی رب العالمین** (26/110)۔ میں اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر صرف خدا کی ربوبیت عالمین کے ذمے ہے۔

لیکن یہ کام انفرادی طور پر کما حقہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے اجتماعی اور منظّم کوشش (Organised Effort) کی ضرورت ہوگی۔ ان کوششوں کا مرکز اور محور ہر شہر اور قریہ کی مقامی بزم طلوع اسلام ہوگی جو وقتاً فوقتاً مرکزی بزم سے راہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔ لہٰذا سب سے پہلے مقدم کام ان بزموں کو زندہ۔ فعال۔ متحرک اور منظّم بنانا ہے۔ آپ اپنی اپنی جگہ مل کر بیٹھئے اور سوچئے کہ اس ضمن میں آپ نے کیا کچھ کیا ہے اور کیا کچھ کرنا ہے۔

اسے بھی نہ بھولئے کہ اس کام میں آپ کی سخت مخالفت ہوگی۔ یہ بات بظاہر بڑی تعجب انگیز سی معلوم ہوگی کہ جب آپ خالص قرآنی نظام کی طرف دعوت دیتے ہیں اور دعوت بھی مسلمانوں ہی کو دیتے ہیں جن کا قرآن پر ایمان ہے۔ اس میں کسی فرقہ یا پارٹی سے متصادم نہیں ہوتے۔ اس کے بدلے میں کسی سے کچھ نہیں چاہتے۔ اپنے سامنے کوئی ذاتی مفاد نہیں رکھتے تو پھر آپ کی مخالفت کیوں ہوگی اور کن لوگوں کی طرف سے ہوگی؟ آپ کی مخالفت مفاد پرست گروہ کی طرف سے ہوگی اور اس لئے ہوگی کہ آپ ان کی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کی راہ میں حائل ہوں گے۔ آپ ان کے شکار کو ان کے فولادی پنجوں سے چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ آپ ان کی جھوٹی سیادت و قیادت کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ خدا اور ان کے بندوں کے درمیان کوئی طاقت حائل نہ رہے اس سے سرمایہ داری اور اس کی محافظ مذہبی پیشوائیت دونوں متحدہ طور پر آپ کی مخالفت میں محاذ بنالیں گی۔ ایک طبقہ اپنا پیسہ

خرچ کرے گا اور دوسرا مذہب کے نام پر عوام کے جذبات کو مشتعل کرے گا۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے اور ہمارا اپنا تجربہ اس کی تائید کرتا ہے۔ جب سے طلوع اسلام نے اس آواز کو بلند کیا ہے مذہبی اجارہ داروں کا ایک گروہ ہے جس نے اس کی مخالفت کو اپنی زندگی کا فریضہ قرار دے رکھا ہے چونکہ اس سے ان کا مقصود اپنے مفاد کا تحفظ ہے اس لئے وہ اس مخالفت میں ہر قسم کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ دروغ بافی اور بہتان تراشی انکا عام شیوہ ہے۔ انہیں یہ کہنے کی تو جرأت نہیں ہوتی کہ ہم اس آوز کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ سرمایہ داری کی خون آشامی اور پیشوائیت کی کفن دزدی کی مخالف ہے۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر فریب دیتے ہیں کہ یہ ایک نئے مذہب کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ شانِ رسالت کے منکر ہیں۔ مسلمانوں میں فِتنہ پھیلاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ سرمایہ داروں کے پیسے کے زور پر اپنے اس پراپیگنڈہ کو وسیع سے وسیع تر پیمانے پر لئے جاتے ہیں۔ ان کے رسالے ہیں۔ اخبارات ہیں۔ پمفلٹ ہیں۔ کتابیں ہیں۔ تنخواہ دار کارندے ہیں۔ وظیفہ خوار ائمہ مساجد ہیں۔ وہ اپنی ان بہتان تراشیوں کو لوگوں تک مسلسل پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انہیں تاکید کرتے رہتے ہیں کہ تم طلوع اسلام اور اس کا لٹریچر ہرگز نہ دیکھنا۔ اس سے تمہارے عقائد خراب ہو جائیں گے اور عاقبت بگڑ جائے گی۔ مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ لوگوں پر کہیں ان کے جھوٹ کا پردہ فاش نہ ہو جائے۔

یہ ہے وہ مخالفت جس سے آپ کو بچنا ہوگا۔ اس سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کبھی نہ الجھئے۔ ان کی تکنیک یہ ہے کہ وہ آپ کو ان بے کار مباحث میں الجھائے رکھیں تاکہ آپ قرآنی نظام کا پیغام لوگوں تک نہ پہنچا سکیں۔ آپ اس سے بچیں اور اپنا مثبت پروگرام جاری رکھیں۔ ان کے اتہامات کی تردید اپنے عمل و کردار سے کریں۔ آپ کی زندگی آپ کی صداقت کی شہادت اور آپ کے دعوے کی دلیل ہو۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوئی ناجائز حربہ استعمال نہ کریں۔ کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں جھوٹ کا کوئی کلمہ اپنی زبان پر نہ لائیں۔ مداہنت یا منافقت کو پاس تک نہ پھٹکنے دیں۔ کبھی ایسا نہ کریں کہ آپ کا عقیدہ کچھ اور ہو اور مصلحت بینی کی بناء پر زبان پر کچھ اور لائیں۔ قرآنی پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے قلب و زبان کی ہم آہنگی نہایت ضروری ہے۔ آپ نے کسی سیاسی مقصد کو حاصل نہیں کرنا کہ آپ کے نزدیک اس مقصد کے حصول کا نام کامیابی ہو خواہ اس کے لئے کوئی ذرائع بھی استعمال کیوں نہ کر لئے جائیں۔ قرآن کی رو سے ذریعہ اور مقصد یا راستہ اور منزل میں کوئی فرق نہیں۔ غلط راستہ انسان کو کبھی صحیح منزل تک نہیں لے جاتا۔

ان شرائط کے ساتھ آپ قرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں۔ تاکہ عوام اچھی طرح سمجھ جائیں کہ صحیح اسلامی زندگی کسے کہتے ہیں اور قرآنی نظام کیا ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی وہ ملک میں صحیح قرآنی نظام نافذ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ بحالاتِ موجودہ پاکستان میں صحیح معاشرہ کے قیام کی یہی ایک صورت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویزؒ

روزوں کا مقصد

(پرویزؒ صاحب کا درسِ قرآنِ مجید)

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۃ النمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۂ بقرہ کی تین چار آیات (2/187-183) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں' اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ انکے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنِ کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی:

انزل اللہ علیک الکتٰب والحکمۃ۔
(4/113)

''اے رسولؐ! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے''۔

کتاب کے معنیٰ احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد' ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز' عظیم حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے۔ تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کرے گا' بطیبِ خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرِ مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں۔ تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس

حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے مکینکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی۔ اور یا اس کے استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کتب علیکم الصیام (2/183) ''اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں۔'' یہ ''کتاب'' یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا:

لعلکم تتقون (2/183) لعلکم تشکرون (2/185) اور ولتکبرو اللہ علی ما ھدٰکم۔ (2/185)۔

تتقون سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ **تشکرون** سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآنِ کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکمِ خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم

سب سے پہلے لفظ ''کبریائی'' کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ تکون لکما الکبریاء فی الارض (10/78) ''تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے''۔ اس سے لفظ ''کبریائی'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہِ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں، یارائے سرکشی نہیں: ولہ الکبریاء فی السمٰوٰت والارض وھو العزیز الحکیم (45/37)۔ ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔'' دوسری جگہ ہے: وھوالذی فی السماء الہ و فی الارض الٰہ۔ (43/84)۔ ''وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار۔'' (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار ازخود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی ازخود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ یٰایھا المدثر۔ ''اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نَو کا مظہر بن جائے گا۔ (**المدثر** کے یہی معنی ہیں)۔ قم فانذر۔ ''اُٹھ اور نوعِ انسان کو اُن کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے۔'' وربک فکبر (74/1-2)۔ ''اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو''۔۔۔۔ یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے۔ لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ ولم یکن لہ شریک فی الملک۔ ''حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔'' اور اس سے آگے ہے: وکبرہ تکبیراً۔ (17/111) ''لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو۔'' اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ: المتکبر (59/23) کہا ہے۔ کہیں الکبیر المتعال (13/9) اور کہیں: العلی الکبیر۔ (22/62)۔ ہماری دنیا میں وہ العلی الکبیر کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فالحکم للہ العلی الکبیر (40/12)' تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ۔۔۔ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطۂ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکٰفرون (5/44)۔

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے' وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔۔۔ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدانِ جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:

وجعل کلمة الذین کفروا السفلیٰ وکلمة الله هی العلیا(9/40)۔

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے' عملاً مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:

هوالذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون(9/33)۔

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تا کہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظامِ خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ محمد رسول الله والذین معه(48/29)۔ کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے **الاعلیٰ** اپنے آپ کو کہا تھا۔ لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں **الاعلون** کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین (3/138)۔ ''اگر تم مؤمن ہو اور مؤمن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے''۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآنِ کریم نے ان کنتم مومنین کی شرط عائد کر دی ہے۔ ''یعنی اگر تم مؤمن ہوئے تو''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مؤمن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مؤمن نہیں' کافر ہیں۔ لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

ولن یجعل الله للکٰفرین علی المومنین سبیلا(4/141)۔

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مؤمنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مؤمن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مؤمنین سے کہتا ہے کہ: انتم الاعلون ۔لیکن مؤمن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ الاعلی میں نہیں۔ سبحن ربی الاعلی۔۔ الاعلی کے شایانِ شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں' جو ہمیں الاعلون کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں' تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہر مانیت ہے' مؤمن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

سا صرف عن اٰیٰتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق۔(7/146)

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں' ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہوگی۔

☆☆☆☆☆

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہٰی کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لتکبرو اللہ علی ما ھدٰکم۔ صدرِ اول کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تا کہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے' لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (2ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟۔۔۔ لتکبرو اللہ علی ما ھدٰکم۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ۔۔۔۔ (Reservists) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تا کہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہٰی دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی

گئی' اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ۔ شھر رمضان الذی انزل فیہ القران (2/185) ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی۔'' قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ قرار دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔

قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذٰلک فلیفرحوا۔ ھو خیر مما یجمعون۔ (10/58)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزول قرآن ہے۔ قرآن' خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لتکبرو اللہ علی ما ھدٰکم۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا باترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ ''تاکہ تم خدا کی بڑائی کرو۔'' یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس ''بڑائی بیان کرنے'' کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں' ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر' اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ و فغاں کہا تھا کہ

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر' دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اللہ اکبر

کبریائی صرف خدا کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا

اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی ''شہادت دیتا ہوں''۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے۔ یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابل قبول ہونا تو درکنار' اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا' اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو ''خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔'' والملٰئکۃ ''اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں''۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں' کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے: واولوا العلم قائماً بالقسط۔ ''ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ لا الٰہ الا ھو العزیز الحکیم (3/17) ''خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں' بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے''۔

آپ نے غور فرمایا کہ۔۔۔ قرآنِ کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من' میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری

تفسیر بالروایت

روایات کو دین قرار دینے والے طبقہ میں ایک طبقہ تو متشدد دین کا ہے۔ انہوں نے یہ عقیدہ پھیلا رکھا ہے کہ روایات قرآن کے بالکل ہم پلہ ہیں' مثلہ معہ' قرآن کے ساتھ' بالکل قرآن کی مثل' بلکہ بعض معاملات میں تو روایات قرآن کی ناسخ بھی قرار دی جاتی ہیں۔ روایات کو قرآن کی مثل قرار دینے کے لئے انہوں نے یہ عقیدہ پھیلا رکھا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں' ایک وحی متلو (وہ جس کی تلاوت کی جاتی ہے' یعنی قرآن) اور دوسری وحی غیر متلو (وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی' یعنی روایات) جو اہلِ بصیرت تھوڑے سے تدبر سے خدا اور اس کے رسول کے مقامات پر غور کریں گے وہ بلا تامل اس نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ خدا' خدا ہے اور اس کا رسول' رسول اور اس لئے خدا کا کلام اور رسول کی باتیں کبھی ہم پایہ نہیں ہوسکتیں۔ ان دونوں میں اتنا ہی فرق ہوگا جتنا عابد اور معبود میں ہوتا ہے کہ رسول کے لئے بلند ترین مقام عبدیت ہی کا ہے اور کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ اشھد ان لا الہ الا اللہ کے ساتھ اشھد ان محمد عبدہ' و رسولہ کا اعلان نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود وہ لوگ موجود ہیں جو خدا اور رسول کے کلام کو ہم پایہ قرار دیتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ کل قیامت کو جب رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ تم نے مجھے خدا کا ہم پایہ کس طرح قرار دے دیا تو یہ کیا جواب دیں گے۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والے اَن پڑھ لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو بڑے بڑے جید علماء قرار دیئے جاتے ہیں اور بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ حیدر آباد (دکن) کے ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے اپنی ایک کتاب Muslim Conduct of State میں لکھا ہے کہ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے الفاظ ہم پایہ (on a par) ہیں۔

On the basis that what the messenger uttered on behalf of the sender is taken as the sender's words.

ذرا سوچئے کہ یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے یعنی کچھ باتیں تو ایسی ہیں جو خدا نے خود اپنے الفاظ میں پیغمبر ﷺ سے کہہ

دیں اور پیغمبرؐ نے انہیں لوگوں تک پہنچا دیا اور کچھ باتیں ایسی ہیں جو پیغمبرؐ نے خدا کے Behalf پر کہیں' لہٰذا یہ بھی خدا ہی کی باتیں ہوگئیں۔ یعنی یا تو معاذ اللہ' اللہ میاں میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اپنی پوری بات اپنے الفاظ میں کہہ دے اور یا جو کچھ خدا نے کہا وہ ناتمام تھا اور اس کی تکمیل رسولؐ نے کر دی' اور یہ تکمیل رسول نے اپنی طرف سے نہیں کی بلکہ On behalf of the sender کی۔ on behalf کا ٹکڑا قابل غور ہے اور اس لئے ہم اس ٹکڑے کو اصل الفاظ میں لکھ رہے ہیں' اس کا ترجمہ نہیں کر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کو اس کا اہل ہی نہیں سمجھتے کہ وہ انسانوں کے لئے مکمل ہدایت از خود دے سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اس کی ہدایت کہیں مبہم ہوتی ہے' کہیں ناتمام اور کہیں (معاذ اللہ) غلط بھی۔ ہدایت خداوندی کے ابہام کی وضاحت روایات کرتی ہیں۔ مثلاً خدا نے کہا کہ ہر شخص کو اپنے ترکہ کے لئے وصیت کرنی چاہئے۔ روایات کہتی ہیں کہ یہ حکم مبہم ہے' وصیت صرف ایک تہائی میں کرنی چاہئے اور وہ بھی وارث کے حق میں نہیں۔ خدا کی ہدایت کے ناتمام ہونے کی مثال یہ لیجئے کہ خدا نے کہا کہ زانی اور زانیہ کو سو سو کوڑے لگاؤ اور روایات کہتی ہیں کہ یہ حکم غیر شادی شدہ کے لئے ہے' شادی شدہ زانی اور زانیہ کو سنگسار کر دو اور خدا کی ہدایت کے غلط ہونے کی مثال واضح ہے کہ روایات کی رو سے قرآن کی سینکڑوں آیات ایسی ہیں جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے' کہیں دوسری آیات سے اور کہیں خود روایات سے۔

ایک دوسرا طبقہ ہے جو روایات کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر بیان کرتی ہیں اور چونکہ رسول اللہ ﷺ سے بہتر کوئی اور شخص قرآن کو نہیں جان سکتا تھا اس لئے جو تفسیر روایات بیان کرتی ہیں وہی قرآن کا صحیح مفہوم ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے بہتر کوئی شخص قرآن کو نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کی جو تفسیر رسول اللہ ﷺ نے فرمائی وہ آج ہے کہاں؟ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ وہ تفسیر احادیث کے مجموعوں میں ہے۔ یہ دلیل بظاہر بڑی خوش آئند نظر آتی ہے لیکن جس شخص نے احادیث کے مجموعوں کو دیکھا ہے وہ اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اول تو ان مجموعوں میں تفسیر کے متعلق بہت تھوڑا سا حصہ ہے اور جتنا کچھ ہے وہ خود بتا رہا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کا نہیں ہوں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اگر آپ از خود اس کی تصدیق چاہتے ہیں تو اس کا نہایت آسان ذریعہ یہ ہے کہ آپ زیادہ نہیں صرف ایک صحیح بخاری کو لے لیجئے (اگر آپ عربی نہیں جانتے تو اس کا اردو ترجمہ ہی منگا لیجئے) پھر اس میں سے تفسیر سے متعلق باب نکالئے اور خود دیکھئے کہ کیا آپ کا دل گواہی دیتا ہے کہ اس ذات گرامی ﷺ نے جو علمِ انسانی کے بلند ترین افق پر فائز المرام تھی کیا قرآن کے متعلق اس قسم کی تفسیر فرمائی ہوگی؟ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے از خود ان تفسیری روایات کا مطالعہ نہیں کیا

علامہ اسلم جیراجپوری نے اپنے اس مختصر سے مضمون میں چند روایات بطور نمونہ درج فرمائی ہیں۔ آپ انہیں دیکھئے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ کیا اس تفسیر کو رسول اللہ ﷺ کی تفسیر قرار دیا جا سکتا ہے؟ معلوم نہیں کس کس نے ان روایات کو وضع کیا اور پھر کتنی دلیری سے انہیں حضور ﷺ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا۔ اب مسلمان ہیں کہ ان روایات کو منسوب الی الرسول کی بجائے خود رسول اللہ ﷺ کی تفسیر قرار دے رہے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ان روایات کی رو سے خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے شانِ نبویؐ اس سے کس قدر ارفع اور اعلیٰ ہے۔ علامہ حافظ اسلم نے اپنے مضمون میں صرف چند ایک روایات بیان فرمائی ہیں ورنہ صرف ایک بخاری سے اس قسم کی کتاب پر مشتمل مبسوط مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

ان مضامین سے آپ سمجھ سکیں گے کہ روایات کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کی جو کوشش طلوعِ اسلام کر رہا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ دین خالص مسلمانوں کے سامنے آ جائے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے خلاف عجمی سازش نے جو افترا پردازیاں کر رکھی ہیں انہیں الگ ہٹا کر حضور ﷺ کی سیرۃ طیبہ کو اس کے صحیح مقامِ بلند پر دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

(طلوع اسلام)

☆☆☆☆☆☆☆

ائمہ حدیث نے حدیثوں کی رو سے تفسیر بالرائے کو تو حرام قرار دیا ہے، لیکن تفسیر بالروایت کے طریق کو محفوظ خیال کیا ہے حالانکہ روایت سوائے تواتر کے خواہ کسی درجہ کی ہو ظن سے آگے نہیں بڑھتی۔ علاوہ بریں تفسیر میں جو روایتیں ہیں ان کے متعلق خود ائمہ حدیث کی شہادت ہے کہ وہ بالعموم ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ جو امیر المومنین فی الحدیث کہے جاتے ہیں، ان کا قول ہے کہ:

''تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، ملاحم، مغازی اور تفسیر۔''

عام خیال یہ ہے کہ ''صحاح ستہ'' میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں مگر ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی امام موصوف کے اس قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ چنانچہ میں صحاح ستہ سے تفسیر بالروایت کی چند مثالیں نکال کر پیش کرتا ہوں، جن میں سے کچھ تو خود قرآن کے مخالف ہیں، کچھ دوسری حدیثوں سے متعارض اور بعض علم و عقل کے خلاف، جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تفسیریں رسول اللہ ﷺ کی ہرگز نہیں ہو سکتیں۔

(1) واذ قال ابراہیم رب ارنی کیف تحی الموتیٰ۔ قال اولم تؤمن۔ قال بلیٰ ولٰکن لیطمئن قلبی (2/260)۔

اور جب کہا ابراہیمؑ نے کہ اے میرے رب! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا تو ایمان نہیں لایا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ بے شک (میں ایمان لایا ہوں) لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔

اس کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہؓ سے صحیح بخاری میں یہ روایت

درج کی گئی ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم ابراہیمؑ سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں جبکہ انہوں نے کہا کہ اے رب! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔

یہ روایت قرآن کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔ کیونکہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کی تصریح کر دی ہے اور وہ بھی ''بلیٰ'' کے لفظ کے ساتھ' یعنی بے شک میں مومن ہوں اور ایمان نام ہے علم الیقین کا جس میں کوئی شائبہ شک کا نہ ہو۔

انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللہ و رسولہ ثم لم یرتابوا۔ (49/15)۔

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے شک نہ کیا۔

چہ جائے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم رسول کا ایمان اللہ کے مُردوں کے زندہ کرنے پر جو بادشاہ سے اسی مسئلہ پر بحث کر چکے تھے جس کا ذکر اس سے پیشتر کی آیات میں ہے۔ ان کو اس کے اوپر علم الیقین اور ایمان کامل حاصل تھا۔ وہ چاہتے تھے صرف اطمینان اور عین الیقین' نہ کہ کسی شک کا ازالہ۔ مگر یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو شک تھا۔

اور عقل کے خلاف اس وجہ سے ہے کہ جب دنیا کے دوسب سے بڑے پیغمبروں میں سے ایک کو اللہ کی صفتِ احیاء اموات میں شک ہو اور دوسرا اپنے آپ کو ان سے بھی زیادہ شک کا حقدار سمجھے تو پھر ایمان اور یقین کس کے اندر تلاش کیا جائے گا؟

(2)ان زلزلۃ الساعۃ شی عظیم۔ یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت و تضع کل ذات حمل حملھا (1-22/2)۔

بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے۔ جس دن تم اس کو دیکھو گے اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو جسے اس نے دودھ پلایا ہے بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل جَن دے گی۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کا زلزلہ اس قدر ہولناک ہوگا کہ اس کو دیکھتے ہی دودھ پلانے والیاں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی اور حمل والیوں کے حمل مارے خوف کے گر جائیں گے۔ لیکن اس کی تفسیر روایت میں یوں ہے کہ:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن آدم سے کہے گا کہ تم اپنی ذریت میں سے جہنم کا حصہ نکالو' وہ کہیں گے کہ کس قدر؟ جواب ملے گا کہ ایک ہزار میں سے 999۔ اس وقت حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے۔

یہ خلاصہ ہے بخاری کی روایت کا اور یہی ترمذی میں بھی ہے مگر یہ تفسیرِ قرآن کے بالکل منافی ہے کیونکہ قرآن میں ذہول اور وضع حمل کی علت زلزلہ کی ہولناکی ہے اور اس روایت میں جہنم کا حصہ نکالنے کے حکم کی گرانی۔ قرآن میں اس کا وقت ہے ''یوم ترونھا'' جس دن تم زلزلہ کو دیکھو گے اور روایت میدانِ قیامت میں محاسبہ کا وقت اس کے لئے معین کرتی ہے' جہاں کسی زلزلہ کا ثبوت نہیں۔

پھر یہ میدانِ قیامت میں ہر قسم کے مونث جان داروں میں حمل کس وقت کے ہوں گے جو گریں گے اور وہاں ان کے اسقاطِ حمل کی غرض و غایت کیا ہو گی؟ اگر اس کو مجازاً محض شدتِ خوف کا استعارہ سمجھا جائے تو جب حقیقی معنی بن سکتے ہیں تو مجازی معنی لینے کی کیا ضرورت ہے؟

آیت سے ذہن جس امر کی طرف متبادر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حالت دنیا میں نفخ صورِ اول کے وقت ہو گی' جب آسمان پھٹ جائے گا' ستارے ٹوٹ پڑیں گے' زمین میں بھونچال آئے گا اور شور برپا ہو گا' لیکن یہ روایت اس کو نفخِ صورِ دوم کے بعد میدان قیامت کا حال قرار دیتی ہے جو آیت کے سراسر خلاف ہے' اس لئے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہرگز نہیں ہوسکتا۔

(3) ولقد اٰتینا موسیٰ تسع اٰیٰت بینٰت (17/101)۔

اور ہم نے موسیٰؑ کو نو(9) کھلی ہوئی نشانیاں دیں۔

اس کی تفسیر روایت کے ساتھ اس طرح کی گئی ہے:

ایک دفعہ آنحضرت تشریف فرما تھے۔ سامنے سے دو یہودی گذرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو' سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہو گا) اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰؑ کو نو آیتیں کونسی دی گئی تھیں؟ آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں۔ 1- کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ' 2- زنا نہ کرو' 3- کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو' 4- چوری نہ کرو' 5- جادو نہ کرو' 6- کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ' 7- سود نہ کھاؤ' 8- کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ' اور 9- میدانِ جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لئے اے یہود! دسواں حکم یہ ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔ یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی' مسند امام احمد' نسائی' ابن ماجہ اور ابنِ جریر میں ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکامِ تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے اور جس کو امام ترمذی نے ''حسن صحیح'' کہا ہے' نہ صرف یہ کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کی رو سے اس کا صحیح ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ یہ نو نشانیاں حضرت موسیٰؑ کو اس وقت ملی تھیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس وقت تک نہ توراۃ نازل ہوئی تھی اور نہ اس کے احکام عشرہ تھے۔ ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ نمل میں ہے:

فی تسع اٰیٰت الی فرعون و قومہ (27/12)۔

نو (9) نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔

پھر سورۂ اعراف میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ان نشانیوں کو گنا دیا ہے' یعنی عصا' ید

بیضا' قحط' نقصِ ثمر' طوفان' ٹڈی' جوں' مینڈک اور خون۔

اس کے مدتوں بعد حضرت موسیٰؑ اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے ہیں۔ فرعون معہ اپنے لشکر کے ان کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں غرق ہوتا ہے اور حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے کوہِ طور کی طرف آتے ہیں۔ وہاں اللہ ان کو میقات پر بلاتا ہے اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے تورات عطا کرتا ہے۔

یٰموسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسٰلٰتی و بکلامی فخذ ما اتیتک وکن من الشاکرین و کتبنا لہ فی الالواح من کل شئی موعظۃ و تفصیلا لکل شئی۔ (7/145-144)۔

اے موسیٰ! میں نے تجھ کو اپنے پیغامات اور اپنی ہمکلامی کے لئے لوگوں پر چن لیا' سو جو کچھ میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر کر اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھ دی۔

علاوہ بریں اس روایت میں سود نہ کھاؤ' جادو نہ کرو' میدانِ جہاد سے نہ بھاگو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے احکامِ عشرہ میں سے گنائے گئے ہیں' حالانکہ ان تینوں میں سے ایک بھی ان میں سے نہیں ہے۔ احکامِ عشرہ یہ ہیں:

(4) بدقسمتی سے مسلمانوں میں عہدِ صحابہ ہی میں جھگڑے پیدا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اشخاص کے مناقب قرآنی آیات سے بھی نکالنے کی کوشش ہونے لگی تھی۔ چنانچہ بہت سی آیتوں کی تفسیر ایسی روایتوں کے ذریعہ سے کی گئی ہے جن سے معتقد علیہ شخصیتوں کے فضائل ثابت ہوں۔ سورۂ حج میں ہے:

الم تر ان اللہ یسجد لہ من فی السمٰوات ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب و کثیر من الناس و کثیر حق علیہ العذاب ومن یھن اللہ فمالہ من مکرم ان اللہ یفعل ما یشاء ھٰذان خصمٰن اختصموا فی ربھم۔ (22/19-18)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وہ اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار اور بہت سے آدمی اور بہتوں پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ دو فریق ہیں جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا ہے۔

آیت میں ''ھٰذانِ'' (یہ دو فریق) کا مشار الیہ موجود ہے کہ بنی نوعِ انسان میں بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے نہیں کرتے یہ دو فریق ہیں کہ ان میں باہمی نزاع رب کے بارے میں ہے مگر روایت یہ کہتی ہے کہ

یہ آیت جنگِ بدر میں حضرت علیؓ اور حمزہؓ اور عبیدہؓ کے متعلق نازل ہوئی جو شیبہ اور عتبہ اور ولید کے مقابلے

کے لئے گئے تھے۔

مشکل یہ ہے کہ سورۂ حج مکی ہے اور جنگِ بدر مدینہ میں ہوئی۔ اس لئے یہ شانِ نزول کیسے ہوسکتا ہے' لیکن چونکہ یہ روایت بخاری میں ہے' اس وجہ سے علامہ جلال الدین سیوطی کو ''ھٰذان'' سے تین اور جامع البیان کو چھ آیتوں کو مدنی قرار دینا پڑا۔ متاخرین نے تو پورے سورہ کو مدنی کہہ دیا۔ چنانچہ وہ مصاحف میں مدنی ہی لکھا جاتا ہے۔

اذنِ قتال سے جو اس سورہ میں مسلمانوں کو دیا گیا ہے' یہ خیال ہوسکتا تھا کہ یہ مدنی ہے۔ کیونکہ یہ اجازت مدینہ ہی میں مل سکتی تھی مگر جامع ترمذی میں روایت ہے کہ یہ اجازت مکہ سے نکلتے وقت ملی۔ اس لئے اس بنیاد پر بھی اس سورہ کو مدنی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ بالفرض اگر یہ آیات مدنی بھی ہوں تو قرآن سے عدول کرنا جس میں ''ھذان'' کا مشارالیہ مذکور ہے' کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟

(5) ''کما بدأنا اول خلق نعیدہ'' کے تحت میں صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

قیامت کے دن میری امت کے کچھ لوگ لائے جائیں گے' جن کو فرشتے بائیں جانب لے جائیں گے (یعنی جہنم میں) میں کہوں گا کہ اے میرے رب! یہ تو میرے اصحاب ہیں' جواب ملے گا کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے بعد انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ تب میں وہی کہوں گا جو نیک بندے (عیسیٰؑ) نے کہا تھا کہ میں جب تک ان میں رہا ان کا نگراں تھا۔ جواب ملے گا کہ جب سے تم نے ان کو چھوڑا یہ برابر مرتد رہے۔

یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی کیوں کہ:

(1) اس تفسیر کا آیت سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔

(2) نبی کریم ﷺ کی سیرت کو غائر نظر سے دیکھنے کے بعد ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے صحابہؓ کے متعلق اس قسم کی غیر ضروری پیشین گوئی کریں۔

(3) عہدِ صدیقی میں بدوی عربوں میں جو ردت منع زکوٰۃ کی پھیلی تھی' وہ اس سے مراد نہیں ہوسکتی' کیونکہ وہ ایک فوری ہنگامہ تھا جس کو صحابہ کرامؓ نے چند مہینوں میں دبا دیا۔ اس کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ''مازالوا مرتدین علیٰ اعقابھم منذ فارقتھم'' جب سے تم نے ان کو چھوڑا ہے یہ برابر آخر دم تک مرتد رہے۔

اصلیت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ نہ بنانے کی وجہ سے ان کے طرف دار صحابہ کرامؓ کے مخالف ہو گئے' یہاں تک کہ ان کے یہاں یہ روایت موجود ہے کہ ''جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تو بجز پانچ کے جملہ صحابہ مرتد ہو گئے۔'' اور ان کا اعتقاد ہے کہ وہ ہمیشہ مرتد رہے۔ بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی ہی میں ان کے ارتداد کی پیشین گوئی فرما دی تھی۔ جس سے دشمنان صحابہؓ کی مزید تائید ہو رہی ہے۔ اس لئے ہم اس روایت کو جس کی وجہ سے صحابہؓ کرام کی ایک جماعت کو مرتد اور جہنمی قرار دینا پڑتا ہے صحیح نہیں مان سکتے۔

(6) قالوا انت فعلت ھٰذا بالھتنا

یابراھیم۔ قال بل فعلہ کبیرھم ھٰذا فسئلوھم ان کانوا ینطقون (21/63-62)

بت پرستوں نے پوچھا کہ اے ابراہیمؑ! کیا تو نے ہمارے بتوں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ (ابراہیمؑ نے) کہا بلکہ اس بڑے (بت) نے کیا ہے۔ ان (ٹوٹے ہوئے بتوں) سے پوچھو اگر بول سکتے ہوں۔

اس کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ:

ابراہیم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا مگر تین بار۔ انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں حالانکہ بیمار نہ تھے اور (اپنی بیوی) سارہؑ کو بہن بتایا۔ پھر بتوں کو خود توڑا اور جب بت پرستوں نے پوچھا تو کہا کہ اس بڑے بت نے توڑا ہے۔

یہ روایت قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے' کیونکہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے:

انہ کان صدیقاً نبیاً۔(19/41)

حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت سچے نبی تھے۔

اللہ جس کو تحقیق کے ساتھ سچا قرار دے یہ کیسے ممکن ہے کہ رسولِ اعظم ﷺ جو اسی کی اولاد اور اسی کی ملت کے پیرو تھے' اس کو کاذب کہیں؟ یہ تین کذب حضرت ابراہیمؑ کے جو بیان کئے گئے ہیں' ان میں سے حضرت سارہ کو بہن بنانے کا واقعہ قرآن میں نہیں ہے اور جس طرح پر یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے اس سے صاف طور پر اس کا مجعول ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ دوسرا جھوٹ کہ انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں تو کیا بیماری کوئی ایسی چیز ہے جو انسان میں نادر و نایاب ہے؟ ہزار ہا قسم کی چھوٹی بڑی بیماریاں ہیں جن سے کمتر کوئی انسان خالی ہوتا ہے۔ اگر اس وقت جبکہ مشرک ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے' انہوں نے اپنی بیماری کا عذر کیا تو اس کو کذب قرار دینے کی کیا دلیل ہے؟ تیسرا جھوٹ کہ انہوں نے بتوں کو خود توڑا اور الزام لگایا بڑے بت پر۔ تو یہ طریق معرضِ بحث میں مخالفوں کو ساکت کرنے کے لئے اختیار کیا تھا جس سے بہتر احقاقِ حق کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ اس کو مشروط کر کے اس طرح فرمایا کہ یہ بڑے بت کا فعل ہے۔ اگر یہ بت بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھ دیکھو۔ جس کو سن کر مشرکوں نے کچھ دل میں سمجھا اور سر جھکا لیا اور کہا کہ تمہیں تو یہ معلوم ہے کہ یہ بولتے نہیں' اس لئے اس قول کو دنیا میں کوئی صاحبِ عقل جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ امام رازیؒ نے اس کو اپنی تفسیر میں اصولِ مناظرہ کے لحاظ سے معارضہ قرار دیا ہے اور پانچ وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ بجائے ایک صدیق نبی کے اس روایت کے راویوں کو جھوٹا کہنا زیادہ آسان ہے۔

(7)یاٰیھا الذین امنوا لا تکونوا کالذین اٰذوا موسیٰ فبراہ اللہ مما قالو (33/69)۔

اے مومنو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا' جنہوں نے موسیٰؑ کو اذیت دی' سو اللہ نے اس کو ان کی تہمت سے بری کر دیا۔

اس کی تفسیر میں جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت

ہے کہ:

حضرت موسیٰؑ بڑے حیادار تھے' اس طرح جسم کو چھپائے رکھتے تھے کہ کوئی حصہ اس کا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بنی اسرائیل کے لوگوں نے ان کو ستانا شروع کیا اور کہا کہ یہ اس قدر جو اپنے بدن کو چھپائے رکھتے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کو برص یا اور اسی قسم کی کوئی بیماری ہے۔ اللہ نے چاہا کہ موسیٰؑ کو ان کی تہمت سے بری کرے۔ سو موسیٰؑ ایک دن تنہائی میں اپنے کپڑوں کو ایک پتھر پر رکھ کر غسل کرنے لگے۔ جب فارغ ہوئے اور کپڑے لینے کو اس کی طرف بڑھے تو پتھر ان کے کپڑوں سمیت بھاگا۔ موسیٰؑ لٹھ لے کر اس کے پیچھے دوڑے یہ کہتے ہوئے کہ اے پتھر! میرے کپڑے' اے پتھر! میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں پہنچ گئے' انہوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ ساخت میں سب سے بڑھ کر حسین تھے۔ اس طرح اللہ نے ان کے الزام سے موسیٰؑ کو بری کر دیا۔ اس جگہ پر پہنچ کر پتھر رک گیا۔ موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لے کر پہنے۔ پھر پتھر کو لٹھ سے مارنے لگے۔ اللہ کی قسم اس میں ان کی لاٹھی کے نشانات ہیں۔ تین' چار' یا پانچ۔

اس روایت میں غور کرنے کے قابل یہ امر ہے کہ راوی قسم کھا کر بیان کرتا ہے کہ پتھر میں ان کی ضرب کے نشانات ہیں' اس جزم و یقین کے ساتھ کہ گویا اس نے خود مارتے دیکھا ہے اور یہ اس کے سچے ہونے کی نشانی نہیں ہے۔ علاوہ بریں پتھر بے جان' بے ارادہ اور غیر متحرک شے ہے۔ اس کا کپڑوں کو لے کر بھاگنا ایک معجزانہ امر ہوگا' جو منجانب اللہ ہی ہو سکتا ہے اور یہ چیز حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم رسول پر مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر اس کو لٹھ مارنے کے کیا معنیٰ؟ غرض امارات کذب اس روایت میں واضح ہیں۔

(8) ''واٰخرین منھم لما یلحقوا بھم'' کی تفسیر میں جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔ پھر اپنا ہاتھ سلمان (فارسی) کے اوپر رکھا اور فرمایا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایمان ثریا پر بھی معلق ہو تو اس کی قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو پالیں گے۔

پھر آیتِ ذیل کی تفسیر میں ہے:

وان تتولوا یستبدل قوماً غیر کم۔ (47/38)

اور اگر تم پیٹھ موڑو گے تو تمہارے سوا کسی اور قوم کو اللہ تمہارے عوض میں بدل لے گا۔

یعنی اے اہلِ عرب! اگر تم اللہ کے ان فرائض کی تبلیغ وغیرہ میں جو اس نے تمہارے ذمہ عائد کئے ہیں اور جن کی ادائیگی کی وجہ سے تم کو ''خیر امت'' کا لقب دیا ہے' کوتاہی کرو گے تو وہ تم کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کو امام الاقوام بنا دے گا جو ان فرائض کو اچھی طرح ادا کر دے گی۔ امام ترمذی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت لکھتے ہیں کہ:

لوگوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا۔ آپ نے سلمانؓ کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا ''اس کی قوم کو' اس کی قوم کو۔''

ان روایات سے اہلِ فارس کے ایمان کی پختگی' ان کی دماغی برتری اور ذہنی فوقیت کی سند رسول اللہ ﷺ کی زبان سے مہیا کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ وہی خلافتِ عباسیہ میں جملہ مناصبِ حکومت پر قابض تھے اور رواۃِ حدیث بھی زیادہ تر عجم ہی سے تھے۔

(9) جب یہ آیت نازل ہوئی: یٰاَیھا الذین اٰمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیماً (33/56)۔ اے مومنو! نبی پر درود بھیجو اور سلام۔ تو حضرت بشیر بن سعدؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم کس طرح آپؐ کے اوپر درود بھیجا کریں؟ آپ نے دیر تک سکوت کیا۔ پھر فرمایا کہ کہو اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلیٰ ال ابراھیم (الی اٰخرہ) یہ وہی درود ہے جس کو مسلمان نمازوں میں پڑھا کرتے ہیں۔

ہر چند کہ یہ روایت صحیح بخاری اور جامع ترمذی دونوں میں ہے لیکن بوجوہِ ذیل قرآن اور اسلام دونوں کے سراسر منافی ہے۔ اور کبھی قولِ رسول ﷺ نہیں ہوسکتی۔

(1) قرآن میں صرف نبیؐ پر درود بھیجنے کا حکم ہے نہ کہ ان کی آل پر۔

(2) اللہ نے فرمایا ہے: ھوالذی یصلی علیکم و ملٰئکته لیخرجکم من الظلمٰت الی النور وکان بالمومنین رحیماً (33/43)۔ (وہی ہے جو تمہارے اوپر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی' تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی میں نکالے اور وہ ایمان والوں پر مہربان ہے) جب اللہ اور اس کے فرشتے تمام مومنوں پر درود بھیجتے ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کا نبی جو رحمۃً للعلمین ہے' صرف اپنی ہی آل پر درود بھیجے اور امت کو اسی کی تعلیم دے جائے۔

(3) رسول اللہ ﷺ کو خود حکم دیا گیا ہے کہ وہ صدقہ دینے والے مومنوں پر درود بھیجیں۔ اس میں کسی خاندان کی تخصیص نہیں ہے۔ وصل علیھم ان صلوٰتک سکن لھم (9/103)۔ تو ان کے اوپر درود بھیج کیونکہ تیرا درود ان کے لئے سکون (قلب) ہے۔

(4) اس درود میں ''آل محمدؐ'' کی کوئی استثناء نہیں ہے' حالانکہ ان میں بیشتر ایسے لوگ ہیں جو اپنے اماموں کو معصوم سمجھتے ہیں اور صحابہ کرامؓ پر جن کے اوصاف قرآن میں اور جن کے اسلامی کارنامے دنیا میں روشن ہیں' تبرا بھیجتے ہیں۔ یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ ایسے تبرائیوں پر ہم درود بھیجیں۔

(5) یہ درود سراسر خاندان پرستی ہے جس سے اسلام کا دامن بالکل پاک ہے۔ اللہ نے مقبولیت کی بنیاد نسل اور خون پر نہیں بلکہ ایمان اور عملِ صالح پر رکھی ہے۔ جس کے

لئے کوئی کنبہ یا قبیلہ مخصوص نہیں۔ یہود جو اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے' ان کا گھمنڈ توڑنے کے لئے صاف کہہ دیا کہ تم نہ اس کے بیٹے ہو نہ محبوب' بلکہ اس کے پیدا کئے ہوئے جیسے اور انسان ہیں ویسے ہی تم بھی ہو۔

قرآن کے حکم کی تعمیل صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے ہو جاتی ہے۔ اس میں آلِ محمدؐ کا اضافہ یقیناً اس وقت ہوا ہے جب کہ بنی امیہ کے تغلب سے بنی ہاشم سلطنت سے محروم ہو کر دین کی راہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اپنی عظمت قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بعض سادہ دل مسلمانوں نے آل کے معنی کو وسعت دے کر تمام امت پر پھیلانے کی کوشش کی ہے اور قرآن کریم کے لفظ ''آل فرعون'' نیز ایک حدیث سے جس کو وہ روایت کرتے ہیں کہ ''من اتبعنی فھو الی'' (جو بھی میری پیروی کرے وہ میری آل ہے) سند لائے ہیں۔ لیکن امام شافعیؒ نے حرملہ کی روایت سے آل کے معنی کو صرف بنی ہاشم و بنی مطلب پر محدود کر دیا ہے۔ نیز دوسری حدیث لا تحل صدقۃ محمد ولا لِاٰلِ محمد (کوئی صدقہ نہ محمدؐ کے لئے حلال ہے نہ آلِ محمدؐ کے لئے) سے دیگر فقہا نے بھی اسی کی تائید کی ہے کیونکہ ان کے نزدیک صدقہ جن لوگوں پر حرام کیا گیا ہے وہ اولادِ ہاشم اور اولادِ مطلب ہی ہیں۔

ازواجِ مطہرات کو بھی اس میں داخلہ نہ ملتا' مگر حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث مل گئی' جس کی بدولت وہ ان میں شامل سمجھی گئیں یعنی کنا اٰل محمد نمکث شھر الا نستوقد ناراً۔ ہم آلِ محمدؐ پر مہینہ کا مہینہ گذر جاتا تھا کہ آگ جلانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ (بوجہ فقر کے)

الغرض آلِ محمدؐ کا مفہوم اس درود میں جمہور اہلِ اسلام کے خیال میں بنی ہاشم و بنی مطلب پر محدود ہے اسی لئے آلہ کہنے کے بعد وہ اصحابہ وازواجہ وغیرہ کے الفاظ بڑھاتے ہیں۔ اگر آل سب کو شامل ہوتا تو اس کی کیا ضرورت تھی؟

(10) قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ۔ (42/23)۔

کہہ دے کہ اس (تبلیغ) پر میں کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا بجز رشتہ کے سلوک کے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر کی ہے کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت جملہ بطون قریش میں تھی۔ اللہ نے آپ کی زبان سے اعلان کرایا کہ کہہ دو کہ میں تبلیغِ قرآن اور تعلیمِ دین پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' صرف رشتہ داری کا برتاؤ میرے ساتھ رکھو۔

امام ترمذی نے اس کو درج کرنے کے باوجود سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ:

''قربیٰ'' کے معنی اس آیت میں ''ال محمدؐ'' کے ہیں' یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولاد کے ساتھ محبت رکھو۔

یہ بھی دراصل وہی پروپیگنڈا ہے اور قرآن کی سراسر تحریف۔ کیونکہ قرآن میں ''الا المؤدۃ لا قربائی'' نہیں ہے بلکہ ''الا المؤدۃ فی القربیٰ'' ہے اور قربیٰ کے معنی رشتہ کے ہیں' رشتہ داروں کے نہیں ہیں۔ عترت کی محبت لازمی

گردانتے سے ان کو خلافت دینا بھی امت کا فریضہ ہو جاتا ہے اور یہی ان کا مقصد تھا۔

جامع البیان میں اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کسی شخص کے دل میں ایمان اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ تم (یعنی عباس اور ان کی اولاد) کو اللہ و رسول کے لئے محبوب نہ رکھے۔

امام ترمذی نے ابواب التفسیر میں تو نہیں مگر کتاب المناقب میں اس کو درج کیا ہے۔ یہ روایت عباسی خلفاء کی محبت کو لازم گردانتی ہے جو بغداد میں حکمران تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس مہبط وحی ﷺ سے جو توحید کا منارہ دنیا میں بلند کرنے کے لئے آیا تھا' ایسا شرکیہ قول ممکن بھی ہے کہ جب تک کسی کے دل میں اپنے ہی جیسے دوسرے بے بس انسان کی محبت نہ ہو' اس وقت تک ایمان کا داخلہ ہی اس میں نہیں ہوسکتا؟ تعجب ہے کہ امت اسلامیہ کے بہترین افراد حضرات عشرہ مبشرہ و اصحابِ بدر کے دلوں میں کیسے ایمان داخل ہو گیا کیونکہ اس وقت تک تو حضرت عباسؓ جن کی محبت شرطِ ایمان کہی گئی ہے خود ہی ایمان نہیں لائے تھے۔

(11) ترمذی میں حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبریل کہتے تھے کہ جب فرعون غرق ہونے لگا اور ایمان لانا چاہتا تھا' کاش اس وقت اے محمد ﷺ تم مجھے دیکھتے کہ میں سمندر کی مٹی لئے ہوئے اس کے منہ میں ٹھونس رہا تھا اس خوف سے کہ کہیں یہ کلمہ نہ پڑھ دے اور اس پر اللہ کی رحمت نہ آ جائے۔

یہ روایت قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ

(1) جبریلؑ ہر جگہ اللہ کی طرح موجود نہیں رہتے۔ قرآن میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ فرشتے بلا حکمِ الٰہی نہیں اترتے۔ (وما نتنزل الا بامر ربک)۔

(2) جبریلؑ روح القدس ہیں' جن کا وظیفہ یہ ہے کہ انبیاءِ کرام کے پاس اللہ کے پیغامات پہنچائیں نہ کہ کلمۂ حق سے روکنے کے لئے کسی کے منہ میں مٹی ٹھونسیں۔

(3) فرشتے اپنے ارادہ یا جذبہ سے کوئی کام نہیں کرتے بلکہ ''یفعلون ما یومرون'' وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ اگر جبریلؑ کا یہ فعل بحکمِ الٰہی تھا تو پھر فرعون ان کے اوپر غالب کیوں رہا۔ کیونکہ قرآن میں تو تصریح ہے کہ اس نے کلمہ پڑھ دیا:

قال اٰمنت انه لا اله الا الذی اٰمنت به بنوا اسرائیل وانا من المسلمین۔ (10/90)

فرعون نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں بجز اس معبود کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمان ہوں۔

اور جبریلؑ کی ساری محنت اکارت گئی۔

(12) وانا لنحن نحي و نمیت و نحن الوارثون ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستاخرین وان

ربک ھو یحشرھم (15/25-23)۔
اور ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں اور ہم اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔ یہ تیرا رب ہی ہے جو ان کو حشر میں لائے گا۔

اس آیت کے سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں اگلوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے گذر گئے اور پچھلوں سے وہ لوگ جو ان کے بعد مرے یا مریں گے یہ سب کے سب اللہ کے علم میں ہیں جو ان کو قیامت کے دن میدانِ حشر میں جمع کرے گا۔ اسی مفہوم کی دوسری آیت میں ہے:

قل ان الاولین والاخرین لمجموعون الی میقات یوم معلوم۔ (56/50-49)

کہہ دے کہ اگلے اور پچھلے ضرور متعینہ دن کی معیاد پر جمع کئے جائیں گے۔

لیکن جامع ترمذی میں روایت ہے حضرت ابن عباسؓ سے کہ:

ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اس کو نہ دیکھیں، مگر کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے اس کی طرف جھانکتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔

مستقدمین اور متاخرین کی ایسی تشریح اور صحابہ کرام پر ایسا الزام نہ صرف قرآن بلکہ عقل کے بھی منافی ہے۔

(13) دو ایک مثالیں تفسیر بالروایت کی ایسی لکھتا ہوں، جن کی خود دوسری حدیث مخالفت کرتی ہے۔ اسراء کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب ہم بیت المقدس میں آئے تو جبریلؑ نے اپنی انگلی سے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں سوراخ ہو گیا۔ براق کو اسی میں (غالباً رسی ڈال کر) باندھ دیا۔

اس کے دو ہی صفحہ کے بعد پھر امام ترمذی حذیفہ بن الیمان سے یہ روایت لکھتے ہیں کہ:

لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے براق کو باندھ دیا تھا۔ کیوں؟ کیا اس لئے کہ بھاگ نہ جائے، حالانکہ اس کو تو اللہ نے ان کے لئے مسخر کر دیا تھا (یعنی نہ وہ بھاگ سکتا تھا نہ اس کو بھاگنے کی ضرورت تھی)۔

یہ دونوں حدیثیں امام ترمذیؒ کے بیان کے مطابق ''صحیح'' ہیں۔

(14) جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک طویل روایت بیان کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین سے آسمان تک پانچ سو سال کی راہ ہے۔ پھر ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک بھی اسی قدر فاصلہ ہے اور آسمان سات ہیں جن کے اوپر عرش ہے اس کا فاصلہ بھی ساتویں آسمان سے پانچ سو سال کی راہ ہے۔ اسی طرح اس زمین کے نیچے زمین ہے پانچ سو سال کی راہ کی مسافت پر اور زمینیں بھی سات ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسری کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ قسم ہے اللہ کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ اگر تم میں سے کوئی

رسی زمین کے اسفل ترین طبقہ میں لٹکائے تو وہ ٹھیک اللہ کے اوپر جا کر گرے گی۔ پھر آپ نے پڑھا۔

ھوا لاول والاٰخر (الآیہ)۔

ھوا لاول والاٰخر کی یہ تفسیر کہ اللہ ادھر سب سے اوپر عرش پر ہے اور ادھر سب سے نیچے تحت الثریٰ میں' رسول اللہ کی نہیں ہوسکتی۔ رواۃ کو تو نہیں لیکن اس حدیث کے شارحین کو یہ احساس ہوا کہ اس سے اللہ کا تعدد لازم آتا ہے۔ چنانچہ خود امام ترمذی نے ان کی یہ توجیہہ نقل کی ہے کہ وہ رسی جو لٹکائی جائے گی' اللہ کی ذات پر نہیں بلکہ اللہ کے علم پر گرے گی' کیونکہ اللہ کی ذات تو ایک ہی ہے اور وہ قرآن کی تصریحات کے مطابق عرش پر ہے۔

مگر پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا جب وہ رسی لٹکائی جائے گی اور طبقہ در طبقہ زمینوں میں لٹکتی ہوئی گرے گی تو اللہ کا علم اس کو محیط نہ ہوگا؟ پھر تحت الثریٰ میں پہنچ کر علمِ الٰہی پر گرنے کے کیا معنیٰ؟

اب اس کے برخلاف ایک دوسری حدیث سنئے کہ وہ بھی ترمذی میں ہے۔ حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک 71 یا 72 یا 73 سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کُھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

غالباً یہ ''کان عرشہ علی الماء'' کی تفسیر ہے اور چونکہ قرآن میں قیامت کے ذکر میں ہے کہ اس دن حاملینِ عرش آٹھ ہوں گے اس وجہ سے بکرے بھی سات ہی ہیں۔ یہ بکرے کس پہاڑ کے ہیں؟ ہم نے شروح حدیث میں اس کا نام بہت ڈھونڈا مگر نہ پایا۔

یہاں افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ یہ رواۃِ حدیث بجز روایت کشی کے اور کوئی علم کمتر جانتے تھے۔ امام ترمذیؒ نے 279ء میں وفات پائی' جس سے تقریباً ایک صدی پہلے سے مسلمانوں میں ہیئت اور جغرافیہ کے فن رائج ہو چکے تھے۔ اگر انہوں نے ان کا مطالعہ کیا ہوتا تو ایسی روایتوں کو صحیح قرار دے کر درج کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

یہ ہے ''مشتے نمونہ از خروارے'' ان روایات کا جو تفسیر قرآن کے متعلق صحاح ستہ میں وارد ہوئی ہیں' جن پر اہل سنت اگر ایمان نہیں تو اذعان ضرور رکھتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تفسیری بلکہ ان کی دیگر روایات کے پایۂ اعتبار کا بھی اہلِ نظر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ دین ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور اس کو افسانہ بنا لینا روحانی موت۔ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اہلِ تقویٰ اور اربابِ بصیرت انسانی باطل آرائیوں سے منہ موڑ کر **قرآنِ حکیم** کی طرف رُخ کریں جو سرتاسر زندگی ہے اور خالص حق نور مبین ہے اور انسانی تشریحات سے بے نیاز اور ہر زمانہ میں ایک نیا عالم پیدا کر سکتا ہے:

مصلحت دیدِ من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خمِ طرۂ یارے گیرند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید امتیاز احمد

پھول جو میں نے چُنے

(''طاہرہ کے نام خطوط'' سے ماخوذ)

عورت اور مرد میں فکر ونظر' خیالات وتصورات' معتقدات و اصولات اور مسلک ومنہاج کا اختلاف جہنم پیدا کر دیتا ہے اس کے برعکس ان چیزوں میں ہم آہنگی اور یک رنگی گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔

☆☆☆

نکاح نام ہے ایک بالغ مرد اور ایک بالغ عورت کے برضا و رغبت باہمی معاہدہ کا کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق بن کر ان تمام حقوق و فرائض کا احترام کرتے ہوئے جو قرآن نے عائد کئے ہیں سکون ومحبت اور ہم آہنگی و یک رنگی کی زندگی بسر کریں گے اور اس طرح معاشرے میں ایک ایسا خوشگوار ماحول پیدا کریں گے جس میں پرورش پا کر ہماری آئندہ نسل متوازن شخصیت کی حامل اور شرفِ انسانیت کی پیکر بنے۔

☆☆☆

ہمارا سارا معاشرہ افراط وتفریط کے جُھولے میں جھول رہا ہے۔ اس میں سکون اور قیام کی اس کے سوا کوئی اور شکل نہیں کہ ہم پرانے انسانوں کے خود ساختہ معاشرہ کو بھی چھوڑ دیں اور نئی حدود فراموشیوں کو بھی الگ رکھ دیں اور معاشرہ کی بنیاد از سرِ نو قرآن کی حدود پر قائم کریں۔ اسی سے وہ جنت مل سکتی ہے جس سے نکلا ہوا آدم اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔

☆☆☆

اگر تم کسی مرد یا عورت کو دیکھو کہ اسے عمر کے کسی حصہ میں یہ اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ اس نے کافی علم حاصل کر لیا ہے اور اب اسے مزید علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تو سمجھ لو کہ وہ ذہن کے اعتبار سے بچہ ہے (کیونکہ) بچہ ہر سٹیج پر سمجھتا ہے کہ اس کا علم کامل ہے۔

☆☆☆

عملی مثال' ہمیشہ زبانی وعظ سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ جن ریفارمرز کے اقوال اور عملی زندگی میں تضاد ہوتا ہے وہ کبھی قوم کی اصلاح نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

اجتماعی اور انفرادی زندگی درحقیقت ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اور تمدن' معاشرت' معیشت' سیاست اور دوسری طرف دوستی کے تعلقات اور گھر کے اندر کی زندگی سب ان شاخوں کے برگ و بار۔ اگر درخت تندرست و توانا ہے تو اس کی ہر شاخ سرسبز و شاداب ہوگی اور اگر اس کی اصل اور

جڑ ہی کرم خوردہ ہو چکی ہے تو اس کے پتے اور ٹہنیاں کسی طرح بھی ہری بھری نہیں رہ سکتیں۔

☆☆☆

گھروں میں حقیقی امن وسکون اور میاں بیوی میں قلبی محبت اور مؤدت کا رشتہ اسی صورت میں قائم ہوسکتا ہے کہ ایک طرف ہم ان خودساختہ زنجیروں کو توڑ دیں جن میں ہم نے اپنی عورتوں کو صدیوں سے جکڑ رکھا ہے اور دوسری طرف ان بے باکیوں کو روکیں جنہیں ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کر لیا ہے..... تاکہ ہمارے گھر جنتی فضاؤں سے معمور ہو جائیں۔

☆☆☆

تاریخ بہرحال ظنی ہے اور اس کے مقابلہ میں قرآن ایک یقینی شہادت ہے اور یہ حقیقت بھی قطعاً یقینی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا کوئی قول یا عمل نہ قرآن کے خلاف ہوسکتا ہے اور نہ ہی شرفِ انسانیت کے خلاف۔ اس لئے ہمیں ظنی چیزوں کو ہمیشہ یقینی چیزوں کے تابع رکھنا چاہئے اگر ہم اپنی تاریخ میں اتنی احتیاط برت لیں تو ہم دین کے معاملہ میں بہت سی الجھنوں سے بچ جائیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

ذہن، جو قرآن بناتا ہے

قرآن کریم، فرقانِ حمید، پوری انسانیت کے لئے حبل المتین اور عروۃ الوثقیٰ ہے کہ جس کو کسی حالت میں بھی شکست تو ایک طرف ذرا سی تڑاخ تک بھی نہیں آسکتی۔ پوری انسانیت اس پر پورا پورا بھروسہ کرسکتی ہے۔ یہ خود روشنی ہے (5/15) جو اس لئے دی گئی ہے کہ انسان اس کی روشنی میں سفر حیات طے کرے۔ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں، اور پوری انسانیت کے اختلافات و تنازعات اس سے رفع ہوسکتے ہیں۔ اس کے مثل کوئی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ ولن تجد من دونہ ملتحدا (18/27) اور تم اس کے سوا کہیں پناہ گاہ نہیں پاؤ گے۔ یہ انسانیت کے لئے آخری پناہ گاہ ہے۔ ہمیشہ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے مصنف کی حیثیت اور علمیت سے لگایا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اس کتاب کی عظمت کا کیا کہنا کہ اس کا ''مصنف'' خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے عنوان Topic سے بھی لگایا جاتا ہے تو اس کتاب کا عنوان Topic بہترین معاشرہ کی تشکیل ہے اور مردہ قوموں کو زندگی بخشنا ہے۔ اس کی تعلیم کے نتائج ملاحظہ کرنے ہوں تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو نگاہ میں لائیے کہ کس طرح ایک اونٹ چرانے والی قوم، نہایت مختصر عرصہ میں قیصر و کسریٰ کے مقام کی وارث بن گئی۔ قرونِ اولیٰ کی جماعت مومنین کی عظمت و سطوت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا۔ لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تو وہ ذلیل و خوار ہوگئے۔ قرآن کریم کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ کسی پہاڑ پر نازل ہوتا تو یہ پہاڑ اس کے ڈر سے پھٹ جاتا (59/21)، ساری انسانیت کا راہنما، امام، مشکل کشا، جنم جنم کا ساتھی، جو قوم بھی اس کو اپنا لے فلک کی پہنائیوں کو چھو لے، ہم مسلمان اس قرآن کریم کے متبع اور اس پر عمل پیرا ہونے کے مدعی ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ ہم اس کی تعلیم کو عام ہونے اور انسانیت کو اس کے قریب آنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ کیونکہ دیگر اقوام ہمیں دیکھ کر یہ غلط تاثر لیتی ہیں کہ ہم قرآن کریم کی تعلیم کو اختیار کرنے کے بعد اس حالت میں ہیں تو وہ کیوں اس تعلیم کو اختیار کریں اور ہماری طرح ذلیل و خوار ہوں۔ اگر چشم حقیقت سے دیکھا جائے تو وہ

اقوام یہ تاثر لینے میں حق بجانب بھی ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیں قرآن کا متبع سمجھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے نظریات کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے اور ہمارے جو خلاف قرآن نظریات ہیں وہ خود زوال' ادبار' اور تباہی و بربادی کے داعی ہیں۔ فرقہ بندی' دنیا کو حقارت سے دیکھنا' تصوف کے زیر اثر Perceptual Knowledge کو حقیر جاننا' عقل سے حاصل کردہ علوم کی اہانت کرنا' علم کا ذریعہ صرف باطنی واردات کو سمجھنا' روایات کے زیر اثر قرآن کریم کی خلاف عقل تفسیر کرنا' ایک ہزار سال بیشتر کے بنائے ہوئے قوانین کو وحی الٰہی کی طرح غیر متبدل قرار دینا۔ عربوں کی معاشرت کو دین کا حصہ سمجھ کر ان سب پر عمل کرنے پر اصرار کرنا اور معاشرہ کو Static بنا دینا' یہ سب نظریات زوال کے داعی ہیں اور کوئی بھی ترقی پذیر قوم ان نظریات کو اپنائے گی وہ انشاء اللہ چند سال میں زوال پذیر ہو جائے گی۔ ہم مسلمانوں کے لئے یہ اہم ترین بات ہے کہ جب تک ہم حدیث کو وحی الٰہی سمجھتے رہیں گے اور اس کی رو سے کردہ تفسیر کو آخری تفسیر سمجھیں گے اور قرآن کریم کی روشنی اور روشن ہدایت کو انہیں میں محصور و محدود کر دیں گے اور جب تک اپنے ایک ہزار سال پرانے قوانین کو غیر متبدل سمجھتے رہیں گے' مسلمان ہزار جتن کر کے دیکھ لیں' کسی صورت میں بھی ترقی نہیں کر سکتے اور یہی اور صرف یہی دو ستون ہیں جن پر ہماری پوری پیشوائیت قائم ہے۔ آپ یہ دو ستون توڑ دیں پیشوائیت دھڑام سے نیچے گر جائے گی۔ مسلمانوں کی تو ترقی کا راز ہی اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ خلافِ قرآن نظریات کو ترک کر دیں۔ قرآن کریم کی وہ تفسیر کریں جو موجودہ علوم کی بھی راہنمائی کرے۔ موجودہ علوم نے عقل انسانیت کو جہاں تک پہنچا دیا ہے وہ بے شک قابل تعریف و تبریک ہے۔ اب قرآن کریم کی وہ تفسیر پیش کی جائے جہاں قرآن کریم عقل انسانی کو لے جانا چاہتا ہے۔ وحی میں خود اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہ عقل انسانی کو اپنی طرف کھینچتی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ وہ طریقہ اختیار کیا جائے جس سے وحی کی صحیح تعلیم سامنے آ رہی ہو' اور اس کا واحد طریقہ تفسیر بالروایت کو فوراً چھوڑ کر تفسیر القرآن بالقرآن میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ تفسیر القرآن بالقرآن سے خارج از قرآن نظریات کٹکر الگ ہو جاتے ہیں اور تصریف آیات سے صرف اور صرف قرآن کریم کی خالص تعلیم سامنے آنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ؎

سرکتی جاتی ہے رُخ سے نقاب آہستہ آہستہ
نکلتا جا رہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ

اور قرآن کریم خود آپ سے بولنے لگتا ہے۔ قرآن کریم انسان کا جو ذہن بنانا چاہتا ہے افسوس کہ ہم نے وہ نظریات قبول ہی نہیں کئے۔ ہمارا ذہن تو ان خیالات کی آماجگاہ ہے جو سراسر قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم جو ذہن بنانا چاہتا ہے اس کی اولین پہچان یہ ہے کہ وہ زندگی کو نہ صرف ایک حقیقت سمجھتا ہو بلکہ اس کو بامقصد Purposeful بھی جانتا ہو۔ جو لوگ قرآن کریم پر ایمان نہیں لاتے زندگی کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بھی حیوانات کی طرح

طبعی جسم رکھتا ہے اس کا جسم فطرت کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ان ہی قوانین کے مطابق اسے موت آ جاتی ہے۔ قرآن حکیم اس نظریہ کو حیوانی سطح کی زندگی قرار دیتا ہے اور کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: والذین کفروا یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم (47/12)۔ اور جو لوگ انسانی نظریہ زندگی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں چین کرتے ہیں اور (اس طرح بےفکری سے) کھاتے پیتے ہیں اور آخر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اس کے برخلاف قرآن یہ ذہن بناتا ہے کہ انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں ہے اس کے پاس اس جسم کے علاوہ انسانی ذات 'Self' ''زندگی'' بھی ہے جو اس کو جانوروں سے ممیّز کرتی ہے۔ اس انسانی ذات کی نشوونما اس کا فریضہ ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی تربیت کے لئے طبعی قوانین مقرر ہیں اسی طرح ذات کی بالیدگی حاصل کرنے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوانین عطا کئے گئے ہیں۔ جو مستقل اقدار کہلاتے ہیں اور جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ نشوونما یافتہ ذات' انسانی جسم کی موت کے بعد مرتی نہیں بلکہ زندہ رہتی ہے اور مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

اس زندگی کو ارتقائی منازل میں پہنچانے اور اس کو نشوونما دینے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا الگ ملک ہو اس میں ان کی اپنی حکومت ہو' اور اس حکومت کا فریضہ یہ ہو کہ ان اقدار کے نفاذ سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ جو حکومت مستقل اقدار پر قائم ہوگی' اس میں انسانی ذات کی نشوونما ازخود ہوتی جاتی ہے اور اس حکومت کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ قرآن کریم کا بنایا ہوا ذہن اس حکومت میں قرآن کریم کو اور صرف قرآن کریم کو حجت تسلیم کرتا ہے اور حکومت کے سارے فیصلے قرآن کریم کے مطابق ہوتے ہیں۔ وما اختلفتم فیہ من شئ فحکمہ الی اللہ (42/10)۔ اور جس چیز میں بھی تم اختلاف کرو اس کا فیصلہ قرآن کے مطابق ہونا چاہئے اس حکومت کا قیام اس غرض سے ہوتا ہے کہ وہ ساری انسانیت کی خدمت کرے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنون باللہ (3/110)۔ ہم نے اے جماعت مومنین تمہیں اٹھا کھڑا کیا ہے تاکہ تم ایسا نظام قائم کرو جو عالم گیر انسانیت کے لئے نفع رساں ہو' اس کے لئے ضروری ہے کہ تم ان باتوں کا حکم دو جسے قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکو جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ تم دوسروں کے لئے نفع رساں اسی صورت میں ہو سکتے ہو کہ جب تم خود ان قوانین کی صداقت پر پورا یقین رکھتے ہو۔ مسلمان کا تو کام ہی نہیں کہ وہ کسی کو نقصان پہنچائے وہ تو ساری انسانیت کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ قرآن کریم کے معروف جاری کریں اور قرآن نے جن

چیزوں سے منع کیا ہے ان سے انسانیت کو روکیں۔ مزید ارشاد ہوا کہ: وکذلک جعلنکم امة وسطا لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیداً (2/143)۔ اور ہم نے تمہیں ایک ایسی قوم بنایا جسے ساری دنیا میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلہ پر ہو۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی ہو اور نہ کسی سے کھچی ہوئی ہو اور اس کا فریضہ زندگی یہ ہو کہ وہ تمام اقوام عالم کے اعمال کی محاسب و نگراں ہو اور ان کے اپنے اعمال کا نگران ان کا رسول ہو اور اس کے بعد اس کے جانشین ہوں جنہیں اس نظام خداوندی میں مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ قرآنی ذہن کے مالک افراد جو حکومت قائم کرتے ہیں اس حکومت میں علاوہ اس کے کہ امن و امان قائم ہوتا ہے اور ہر شخص کو رزق فراوانی سے ملتا ہے' اس حکومت کی چند خاص خصوصیات ہوتی ہیں جو قرآن کریم کی تعلیم سے متاثر ہونے کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔

قرآن کریم' فرقان حمید' نے جو انقلابی نظریات اس دورِ تاریک میں عطا فرمائے ان میں سے ایک اعلیٰ ترین نظریہ یہ ہے کہ انسان کی حکومت انسان پر قطعاً حرام ہے اور حکومت کا حق بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ قرآن کریم تو الٰہ کا لفظ ہی حاکم کے معنے میں استعمال کرتا ہے۔ جب فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی کشمکش زور پکڑ گئی اور فرعون کو خوف محسوس ہوا کہ حضرت موسیٰؑ اس کے لئے خطرہ کا باعث نہ بن جائیں تو اس نے بڑی تہدید و تعدی سے حضرت موسیٰؑ کو دھمکی دے کر کہا: قال لئن اتخذت الھا غیری لا جعلنک من المسجونین (26/29)۔ تو فرعون نے کہا کہ اگر تم نے میرے سوا اور کسی کو حاکم بنایا تو میں ضرور تمہیں قید کر دوں گا۔ اور یہ نعرہ کہ ہم اللہ کے سوا اور کسی کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتے ہم کم سے کم پانچ بار تو روزانہ اپنی اذان میں بلند کرتے ہیں۔ وھو الذی فی السماء الٰہ و فی الارض الٰـــہ (43/84)' یاد رکھو خارجی کائنات میں بھی وہی الٰہ (حاکم) ہے اور انسانی دنیا میں بھی وہی حاکم (الٰہ) ہے۔ جس طرح ساری کائنات اس کے احکام کے تابع چل رہی ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی حکومت اسی کے احکام کے ماتحت چلنی چاہئے۔ حقِ حکومت سوائے اسی کی ذات کے کسی اور کو حاصل نہیں۔ حکومت کی کوئی بھی شکل ہو' قرآن کریم اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ قانون سازی کے اختیارات کسی ایک انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کے ہاتھوں میں ہوں اور اسی طرح لا محالہ دوسرے انسان ان کی مرضی کے تابع زندگی گذارنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ انسان کی انتہائی تحقیر و تذلیل ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی مرضی کے تابع چلے۔ اس سے انسان شرف انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کو علامہ اقبال نے نہایت مختصر اور غایت درجہ کے پرزور الفاظ میں اپنی ایک رباعی میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت و لے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی در خوئے غلامی ز سگاں خدار تر است
من نہ دیدم کہ سگے پیشِ سگے سرخم کرد

(مفہوم) ''آدمی نے بے وقوفی سے دوسرے آدمی کی فرمانبرداری کرنی شروع کردی۔ آزادی ایک نعمت تھی۔ لیکن انسان نے یہ آزادی قباد وجَم جیسے بادشاہوں کے سپرد کردی۔ اور خود اپنے جیسے انسانوں کی فرمانبرداری کرنی شروع کردی۔ اس سلسلہ میں تو آدمی کتوں سے بھی بدتر ہے کہ میں نے کہیں نہیں دیکھا کہ کوئی کتا اپنے جیسے کتے کی فرمانبرداری کرتا ہو۔'' قرآن کریم کی رو سے کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔ کوئی قانون سازی نہیں کرسکتا۔ قرآنی حکومت تو صرف ایک ادارہ (Agency) ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قوانین نافذ کرتی ہے۔ ان قوانین کو نافذ کرنے والے پہلے خود ان کی اطاعت کرتے ہیں اور پھر دوسرں سے بھی ان کی اطاعت کراتے ہیں۔ وہ خود بھی ان قوانین کے محکوم ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان کا محکوم رکھتے ہیں۔ اس حکومت میں حاکم ومحکوم کی کوئی تفریق نہیں ہوتی اور نہ ہی حکام وافسران بالا کو اس میں کسی قسم کی مراعات Privileges حاصل ہوتی ہیں کہ وہ ان سے فائدہ اٹھائیں اور نہ ہی کسی پابندی سے ان کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ ہر شخص قانون کا پابند ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت کے اولین سربراہ حضورﷺ نے فرمایا: ان اتبع الا مایوحی من ربـــی (7/203) میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے وحی ہوتا ہے۔ فانما علیه ما حمل و علیکم ما حملتم (24/54)۔ جو تم پر فرض ہے تم اس کے ذمہ دار ہو' اور اسی طرح جو رسول پر فرض ہے وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ سورۂ زخرف میں ارشاد ہوا: وانه لذکر لک و لقومک و سوف تسئلون (43/44)۔ اور یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کے لئے ایک قانون ہے اور عنقریب ہی تم لوگوں سے اس کی باز پرس کی جائے گی۔ اس آیت کریمہ میں 'لک' یعنی تیرے لئے کا لفظ اضافہ کرکے خاص طور پر حضورﷺ کو بھی باز پرس کا مکلّف بنایا گیا ہے۔ جب حضورﷺ' جو اولین سربراہِ مملکت ہونے کے علاوہ رسول بھی تھے' وہ قانون کے اس قدر پابند تھے تو آنے والے سربراہان کیسے قانون سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ قرآنی مملکت کا سربراہ اور ہر افسر قانون کا پابند ہوتا ہے۔

مختلف ممالک میں جس قدر بھی حکومتیں قائم ہیں ان میں سے بیشتر میں بہت اچھے قوانین جاری ہیں۔ عقل انسانی نے آہستہ آہستہ ترقی کی ہے۔ اس لئے آج کے قوانین ہزار دو ہزار سال پیشتر کے قوانین سے بہت زیادہ اچھے ہیں۔ دنیا میں فلاحی مملکتیں موجود ہیں جو اپنی اپنی رعایا کی ہر طرح سے فلاح و بہبود کا خیال رکھتی ہیں۔ لیکن ان تمام مملکتوں میں کوئی ایسا انتظام نہیں ہے کہ اس کے باشندے ازخود' اس حکومت کی اطاعت کرنے کی طرف راغب ہوں۔ اور اس کی اطاعت کو اپنے لئے فائدہ مند خیال کرتے ہوں' یہی وجہ ہے کہ سیکولر حکومتوں میں جو حاکم ہیں یا جو بااثر لوگ ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قانون کی گرفت سے بچ سکتے ہیں وہ جرائم کرنے سے اجتناب نہیں کرتے اور جس قدر کوئی شخص بااثر ہوتا ہے اس قدر وہ جرائم کا ارتکاب کرنے پر خود کو سزا سے محفوظ سمجھتا ہے۔ وہاں صرف اتنا کرنا ہوتا ہے کہ جرم کرنے والا پیشتر سے ہی یہ

انتظام کرے کہ وہ قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ اسی لئے ایسے ممالک میں جرائم ہوتے رہتے ہیں۔ جرائم کو روکنے بلکہ اس کا کلیتہً سدباب کرنے کا طریقہ اسلامی حکومت میں یہ ہے کہ وہاں کے عوام کا اس بات پر ایمان ہوتا ہے کہ اس حکومت کی اطاعت اللہ و رسول کی مرادف ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص جرم کرنے کے بعد قانون کی گرفت میں نہیں بھی آتا تب بھی اس کا اس سے یہ نقصان تو ضرور ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ دنیاوی سزا سے تو محفوظ رہا لیکن اللہ و رسول کے ہاں تو گنہگار شمار ہوگا۔ اسلامی حکومت کی یہ وہ اساس محکم ہے کہ جس کے Momentum (حرکت اندرونی) پر وہ حکومت چلتی ہے اگر آپ اس اساس محکم کو نکال دیں تو اسلامی حکومت نہ قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی چل سکتی ہے۔ عام طور پر ہم مسلمانوں میں اسلامی حکومت کی یہ تعریف (Definition) کی جاتی ہے کہ ''اسلامی حکومت وہ حکومت ہوتی ہے کہ جس میں قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں'' اور اس حکومت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت کے مرادف قرار نہیں دیا جاتا۔ اسلامی حکومت کا عملی طور پر نفاذ ہمارے ہاں کہیں بھی نہیں ہے۔ ایران میں بڑی جدوجہد کے بعد اسلامی حکومت قائم کی گئی لیکن وہاں پھر وہی خلاف قرآن نظریہ قائم رہا۔ انہوں نے اپنی حکومت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار نہیں دیا۔ اسی وجہ سے ایرانی انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کاش کہ وہ قرآن کریم کا یہ نکتہ سمجھ جاتے تو ایران میں انقلاب کامیاب ہو جاتا۔ اسلامی حکومت کی توجیہ جواز ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس میں جرم اور گناہ یعنی Crime اور Sin ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لئے جو شخص گناہ نہیں کرے گا وہ جرم (Crime) یعنی حکومت کی خلاف ورزی بھی نہیں کرے گا۔ یہ بات دو تین مثالوں سے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ فرض فرمائیں کہ اگر کوئی شخص سخت گرمی کے دنوں میں روزہ سے ہے۔ گھر میں بالکل تنہا ہے۔ فرج کا ٹھنڈا پانی اس کے پاس رکھا ہے۔ پیاس کی شدت اس کو پریشان کر رہی ہے لیکن وہ روزہ نہیں توڑے گا' وہ سمجھتا ہے کہ روزہ توڑنا گناہ Sin ہے۔ وہی شخص' روزہ کی اسی حالت میں کار میں جا رہا ہے۔ ٹریفک سگنل پر اگر کوئی سپاہی موجود نہیں ہے تو وہ ٹریفک سگنل کی Red Light' عبور کر جائے گا اور وہاں رک جانے کو نظرانداز کر جائے گا لیکن اگر اس کو اس بات کا یقین ہو کہ ایسا کرنے سے وہ ''اللہ و رسول'' کی اسی طرح نافرمانی کر رہا ہے جس طرح وہ روزہ توڑنے سے کرتا تو وہ لال بتی کو کراس نہیں کرے گا اور اس جرم کے ارتکاب سے اسی طرح پرہیز کرے گا جس طرح روزہ توڑنے کے گناہ سے کرتا ہے۔ اسی طرح آپ فرض کریں کہ کوئی افسر ہے اور محکمہ میں اس کی کوئی خاص گرفت نہیں ہے اس لئے وہ دفتر دیر سے آتا ہے۔ وہ قانونی گرفت سے تو بچ گیا لیکن اگر اسلامی حکومت قائم ہے تو وہ اس جرم یا گناہ سے نہیں بچ سکے گا جو اس کی ذات پر ''اللہ و رسول'' کی نافرمانی کرنے کے سبب مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص لاہور سے کراچی کا سفر کرتا ہے اور ٹکٹ نہیں خریدتا'

اتفاق سے راستہ میں اس کی چیکنگ نہیں ہوئی۔ قانون کی گرفت میں تو وہ نہیں آیا' لیکن ''اللہ و رسول'' کی نافرمانی کا مرتکب ضرور ہوا۔ یہ وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جس کے باعث اسلامی حکومت کے حاکم و محکوم' پوری رعایا ازخود حکومت کے فرمانبردار اور مطیع ہوتے ہیں اور اسلامی حکومت میں ہر شخص ازخود قانون کی پابندی کرتا ہے۔ ذہن' جو قرآن بناتا ہے وہ اس حکومت کو قائم کرنے کا بھی متقاضی ہوتا ہے اور ازخود اسکا مطیع و فرمانبردار بھی رہتا ہے۔

اسلامی حکومت روشن خیالی کی بہترین مثال ہوتی ہے۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ قرآن کریم ایک ایسی روشن کتاب ہے کہ جس کو تمام نوع انسانی کے لئے قیامت تک مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات بننا تھا اس لئے اس کتاب میں ہدایات بطور اصول دی گئی ہیں۔ اس نے جزئیات کو عمداً بیان نہیں فرمایا۔ قرآن کریم (Objectives) اہداف مقرر فرما دیتا ہے اور ان کے حاصل کرنے کا طریقہ خود مقرر نہیں فرماتا بلکہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان کو طے کیا جاتا ہے۔ اس طرح اسلامی حکومت جدید سے جدید ترین نظریات پر عمل پیرا ہوسکتی ہے۔ قرآن کریم ایسے معاشرہ کو برہان پر قائم کرتا ہے۔ ہر بات دلیل سے کرتا ہے: ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین (2/111 ,27/64)' اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ نیز ارشاد ہوتا ہے: یا ایھا الذین امنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا ویکفر عنکم سیاتکم ویغفرلکم واللہ ذوالفضل العظیم (8/29)۔ (اے ایمان والو) اگر تم قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کردے گا اور تمہاری معاشی ناہمواریاں دور کردے گا اور تمام خطرات سے تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ امتیازی زندگی سے مراد یہ ہے کہ قرآنی ذہن والوں کی زندگی دوسرے لوگوں سے اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ قرآنی ذہن کے لوگ ہیں۔ نیز اس سے یہ مفہوم بھی ہے کہ قرآنی ذہن والوں میں قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے سے ایک ایسا ملکہ اور ایک ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ فوراً حق و باطل' غلط و صحیح میں فرق محسوس کر لیتے ہیں۔ ان کی اس صلاحیت کو قرآن کریم نے فرقان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس معاشرہ میں لوگ ہر ہر موقع پر درست اور غلط امور میں فوراً فرق محسوس کر لیں گے۔ اس کے علاوہ قرآنی ذہن والے نہایت حلیم الطبع اور ضبط کے مالک ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: لا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم (41/34)۔ بھلائی اور برائی کبھی برابر نہیں ہوسکتی۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو تو تم دیکھو گے کہ جس کے ساتھ تمہاری دشمنی تھی وہ اچانک تمہارا دلی دوست بن گیا۔ جس معاشرہ میں یہ صورت وسعتِ ظرف اور اخلاق حمیدہ کی ہو' اس معاشرہ میں آپس کے تعلقات بہت اچھے اور محبت و خلوص پر استوار ہوں گے۔ قرآنی ذہن رکھنے

والے مومنین کی خصوصیات سورۂ فرقان میں آیت نمبر 63 سے 74 تک' عباد الرحمٰن (اللہ کے بندوں) کے عنوان کے ذیل میں مفصل بیان کی گئی ہیں۔ طوالت کے خوف سے ان کو تحریر نہیں کیا جا رہا ہے۔ جو صاحبان قرآنی ذہن کی صفات و خصوصیات معلوم کرنا چاہیں وہ ان آیات کریمات کا مفہوم' مفہوم القرآن میں خود ملاحظہ فرمالیں اور پھر یہ غور فرمائیں کہ جس معاشرہ میں ان صفات وخصوصیات کے شہری آباد ہوں گے وہ معاشرہ کس درجہ روشن خیال' ایثار پسند اور محبت وخلوص پر مبنی ہوگا۔

یوں تو ہر سٹیٹ کی اپنی اپنی Pre-Requisites ہوتی ہیں۔ اسلامی حکومت چونکہ نظریاتی ریاست (Ideological State) ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا تو مدار وانحصار ہی اس کی آئیڈیالوجی پر ہے۔ اسلامی حکومت کے دو ستون ہوتے ہیں جن کے بغیر اسلامی حکومت نہ تو قائم ہی ہو سکتی ہے اور نہ ہی چل سکتی ہے۔ ایک اساس کا مفصل ذکر ہو چکا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ اس کی اطاعت ''اللہ و رسول'' کی اطاعت ہوتی ہے اور اس کی عدم موجودگی میں ''اللہ و رسول'' کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی۔ انسان اور خدا کا تعلق و رابطہ ہی اس نظام کے توسط سے ہوتا ہے۔ اگر وہ نظام اور حکومت قائم ہے تو انسان اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا رابطہ وتعلق برقرار ہے اور اگر وہ نظام نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے انسان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اللہ و رسول کی اطاعت چونکہ ہر مسلمان کا مطمح نظر ہوتا ہے اس لئے ہر مسلمان اس بات پر مجبور ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرے۔ اسلامی حکومت کی دوسری اساس اس نظریہ پر قائم ہے کہ انسان صرف مادی جسم کا نام نہیں ہے جو عام طبعی قوانین کے ماتحت ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس کے اجزاء کے انتشار سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا' بلکہ انسان' جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی رکھتا ہے جسے اس کی ذات' نفس یا ''زندگی'' کہا جاتا ہے اور جو ناقابل فنا ہے۔ اس کی پرورش اور تربیت انسان کا فرض ہے۔ اور اس کی پرورش قرآن کریم کی مستقل اقدار کے ماتحت ہوتی ہے۔ نفس انسانی پر انسان کے ہر عمل کا اثر مرتب ہوتا ہے اور انسان کے ان اعمال کے اثرات سے اس میں ضعف و استحکام پیدا ہوتا ہے۔ قرآنی ذہن حکومت کی نگرانی کے بغیر بھی کوئی جرم یا گناہ اس لئے نہیں کرتا کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ برے اعمال اور معاشرہ کو خراب کرنے والے کاموں سے' اس کے نفس پر برا اثر مرتب ہوگا۔ یہ تو اس کے ایمان کی مضبوطی پر منحصر ہے کہ اس کا اس بات پر کتنا یقین ہے۔ ہر شخص زہر اس لئے نہیں کھاتا کہ اسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے وہ فوراً مر جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی کا پختہ یقین ہے کہ حرام کھانے سے اس کے نفس کو اضمحلال ہوگا وہ کبھی حرام مال نہیں کھائے گا۔ حرام مال صرف وہ شخص کھائے گا جسے اس کے برے اثرات مرتب ہونے کا پورا یقین نہ ہو۔ قرآنی ذہن چونکہ نفس انسانی پر اعمال کے اثرات مرتب ہونے پر مکمل یقین رکھتا ہے' اس لئے وہ نہ حرام مال کھائے گا اور نہ ہی کوئی ایسا اقدام لے گا جو اسلامی حکومت کے قوانین کے خلاف ہو یا جس سے معاشرہ میں فساد و ابتری

پھیلنے کا خطرہ ہو۔ نفس انسانی پر اثرات کے مرتب ہونے کا عقیدہ وہ بنیان مرصوص ہے جس سے معاشرہ جنت نظیر بن جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کے پیش نظر تو ساری انسانیت ہوتی ہے' جہاں تک نفع رسانی' زندگی کی اہمیت' رزق کی فراہمی' رہائش' تعلیم' سکون و اطمینان اور اسی قسم کی دیگر بنیادی ضروریات کا تعلق ہے' قرآن کریم مسلم و غیر مسلم میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچتا۔ مولانا حالی کا مشہور شعر ہے ؎

یہ پہلا سبق تھا کتاب ھُدیٰ کا
کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا

اسلامی حکومت میں اقلیتوں کی ساری ضروریات کو فراہم کرنا حکومت کا فرض ہے۔ ہمارے فقہ ملوکیت میں غیر مسلموں کی شہادت قبول نہیں کی جاتی۔ لیکن قرآن کریم میں شہادت کے سلسلہ میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں کی ہے' اس لئے غیر مسلم کی شہادت قابلِ قبول ہے۔

قرآن کریم میں جزیہ کا لفظ صرف ایک مرتبہ آیا ہے' حتیٰ یعطوا جز (9/29) جزیہ کا اطلاق اس وقت ہوتا تھا جب مسلمان کسی غیر مسلم ملک کو فتح کرتے تھے تو وہاں کی رعایا اپنے مفتوح ہونے کو تسلیم کرنے کے لئے جزیہ بطور ایک Token کے ادا کرتے تھے۔ اب حالات ہی تبدیل ہو گئے ہیں نہ اب کوئی ملک کسی ملک کو فتح کرتا ہے اور نہ ہی جزیہ وصول کرنے کی صورت یا ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ عیسائیوں کے گرجے' یہودیوں کے معبد Synagouge' خانقاہیں' مساجد' جن میں خدا کا نام لیا جاتا ہے' غیر مسلموں کی تمام عبادت گاہوں کی حفاظت اسلامی حکومت پر فرض و لازمی ہوتی ہے (22/40) اس کے علاوہ یہ کہ غیر مسلم اگر تمہارے پاس آ کر پناہ مانگے' تو اسے پناہ دو پھر اسے اچھی طرح واضح کر دو کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلم کی کیا پوزیشن ہو گی اور کیا کیا حقوق اس کو حاصل ہوں گے۔ اگر اس غیر مسلم کو' اس کی یہ پوزیشن قابل قبول نہ ہو اور وہ اسلامی حکومت میں رہنے کو آمادہ نہ ہو تو تم اسے بحفاظت اس کی پناہ گاہ تک پہنچا دو (9/6)۔ مقصد تو غیر مسلموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا ہے۔ اس ضمن میں یہ حکم بھی ہے کہ اگر کسی ملک میں حکمران جابر ہیں اور ظلم و جور کر رہے ہیں' اور وہاں کی رعایا ان سے عاجز ہے تو اگر وہاں کی مظلوم رعایا مسلمانوں کو مدد کے لئے پکاریں تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس ملک کے نادار' مظلوم' غریب عوام کی مدد کو پہنچیں اور انہیں ان جابر حکمرانوں سے نجات دلوائیں (4/75)۔ خواہ وہ مظلوم غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ غیر مسلموں اور غیر اسلامی حکومتوں سے روابط قائم کرنے کے سلسلہ میں جہاد کا موضوع بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تاہم اس لفظ کو بہت ہی Mis-use کیا گیا ہے۔ لیکن مختصراً یہ عرض ہے کہ قرآن میں جہاد کی اجازت صرف حسب ذیل حالات میں دی گئی ہے۔

(1) اپنی مملکت کی حفاظت کے لئے (22/40)۔

(2) مظلومین کی امداد کے لئے خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں بھی ہوں (4/75)۔

(3) غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کے لئے۔

(4) جو قوم عہد شکنی کرے گی اس سے تصادم ضروری ہے (8/55)۔

(5) اگر کسی جگہ لاقانونیت پھیل جائے تو اس کی روک تھام کے لئے۔

جہاد کے لئے بنیادی اور اولین شرط یہ ہے کہ اسلامی حکومت جہاد کرے گی۔ فرداً فرداً یا مختلف تنظیمیں بنا کر جہاد کرنا درست نہیں ہے۔ اسلامی حکومت بھی ایک بار ہی جہاد شروع نہیں کرتی بلکہ جب اسلامی حکومت ان متذکرہ بالا مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے جنگ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو یہ نہیں کہ اس علاقہ پر ایک دفعہ ہی حملہ کر دے بلکہ وہاں کی حکومت اور اس کے باشندوں پر واضح کرتی ہے کہ ان کے خلاف اس جہاد کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ اس کے بعد ان سے مختلف شرائط پر گفتگو ہوتی ہے۔ اگر کوئی صورت معاہدات کی نہیں بنتی تو مجبوراً ''تلوار'' اٹھائی جاتی ہے۔ ان خلافِ معمول حالات کے علاوہ قرآنی ذہن کبھی بھی لڑائی پر آمادہ نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بہت ہی غیر معمولی حالات ہوتے ہیں جب کہ جہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آپ دیانتداری سے غور فرمائیں کہ ان میں سے کون سی صورت ایسی ہے جس میں کوئی شخص بھی جہاد کو ضروری قرار نہ دیتا ہو اور اس کے کرنے پر اعتراض کرسکتا ہو۔ یہ ساری وہ صورتیں ہیں جن میں قرآن نے جنگ کی اجازت دی تاکہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ البتہ موجودہ دور میں اس لفظ کو اس قدر بدنام کیا گیا ہے کہ ہر شخص ''جہاد'' کو برا تصور کرنے لگا ہے۔ جہاد تو ظلم و جور کو دور کرنے اور دنیا میں امن و امان قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ اور اگر اس کے علاوہ اس کو کسی جگہ استعمال کیا جائے تو وہ قرآنی جہاد نہیں ہوگا۔

وھٰھنا تم منا الکلام
علیٰ مصطفنا الوف سلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر شبیر احمد، فلوریڈا، امریکہ

دستک

مہر کی مہربانیاں

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں چمن سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

موسم خزاں میں جو شاخ شجر سے ٹوٹ گرے اسے ساون کا موسم سرسبز نہیں کرسکتا۔ اسی لئے علامہ اقبالؔ فرما گئے:

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

صاحبو! کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا شادیوں کی ناکامی مغرب کی سوغات سمجھی جاتی تھی۔ برصغیر پاک و ہند کے باشندے (بلا امتیاز مذہب) دنیا میں کہیں رہتے ہوں عام طور سے شادی کے بندھن کو عمر بھر خوب نبھاتے تھے۔ جدائیاں اور طلاقیں کم ہوا کرتی تھیں۔ وہ سہانا وقت اب گئی گزری بات ہوتی جاتی ہے۔ مشرق والوں نے سوچا کہ وہ علم و ہنر میں مغرب سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ کم از کم طلاقوں کی رفتار تو بڑھا لیں۔ ہم برصغیر کے باشندوں میں میاں بیوی کی علیحدگی کا رجحان کیوں بڑھتا جا رہا ہے؟ ان اسباب کا جائزہ انشاء اللہ کسی اور کالم میں پیش کیا جائے گا۔

آج ذکر کرتے ہیں اس عمارت کی بنیادوں کا۔ شعر مشکل سہی لیکن اچھا ہے لہٰذا ترجمے کے ساتھ حاضر ہے۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دے تو دیوار انتہائی بلندیوں تک بھی ٹیڑھی رہے گی۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے رشتے اس لئے نہیں ہو پاتے کہ دولہا والے بھاری بھرکم جہیز کا مطالبہ داغ دیتے ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ دلہن والے لمبے چوڑے مہر کے لئے ضد کرتے ہیں لیکن دنیا کی دیگر اور زیادہ تر قومیں شادی بیاہ سادگی سے کرگزرتی ہیں۔

آج ملاحظہ فرمائیے کہ معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی کیسے رکھتے ہیں؟ جہیز کا معاملہ تو بہت صاف اور سیدھا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں اس کا حکم نہیں ہے۔ روایات میں بھی آپ کو جہیز کی اصطلاح نہیں ملے گی۔ والدین نے دولہا کی ناداری کے سبب اپنی خوشی سے کچھ مدد کر دی ہو تو وہ علیحدہ بات ہے، اسے جہیز نہیں کہہ سکتے۔

حال ہی میں فلوریڈا کی ایک شادی میں دولہا دلہن والوں کے درمیان مہر کے بارے میں اختلاف دیکھا گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ مہر فارسی کا لفظ ہے جو مہربانی اور خیر سگالی کے بہت قریب ہے۔

کتاب اللہ نے دولہا پر فرض عائد کیا ہے کہ وہ نکاح

سے پہلے' ہونے والی دلہن کو خوش دلی سے تحفہ پیش کرے۔ یہ بھی فرما دیا ہے کہ یہ تحفہ دولہا کی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ اس تحفے کا نام کتاب حکیم میں نحلہ (ن ح ل ہ) رکھا گیا ہے۔ نحلہ کا تعلق شہد سے ہے۔ مفہوم صاف ظاہر ہے یعنی ایک شیریں تحفہ۔ یہ شیریں تحفہ دولہا اپنی حیثیت کے مطابق دلہن کو پیش کرے گا۔ تحقیق پسند ریڈرز سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 236 اور سورۃ النساء کی آیات نمبر 19,4 اور 21 ملاحظہ فرمالیں۔

جاہلانہ رواج ہمارے یہاں یہ بن گیا ہے کہ اس شیریں تحفے کو کرنسی بنا کر ''مہر باندھنا'' کہا جاتا ہے۔ اتنے لاکھ روپے کا مہر باندھوتا کہ دولہا شادی کے بندھن میں جکڑا رہے۔ کیا شادی دلوں کا سودا ہوتا ہے یا مال و دولت کا؟ اور تحفہ زیورات و ملبوسات میں میٹھا لگتا ہے یا کیش میں؟

اب ایک دلچسپ بات پر غور کیجئے۔ ایک زمانہ تھا جب ایک تولہ سونے کی قیمت برصغیر میں بتیس روپے چھ آنے ہوا کرتی تھی۔ ہمارے فقیہوں نے لکھ دیا کہ یہ بتیس روپے چھ آنے ہمیشہ کے لئے شرعی مہر رہے گا۔ ''حیثیت کے مطابق'' کا حکم نظر انداز کر دیا اور تحفہ کو کیش بنا کر اس کی روح کھینچ لی گئی۔ پھر شادی کا مقدس عہد نامہ رسہ کشی کی نذر ہونے لگا۔ لڑکے والے لاکھوں روپے یہاں تک کہ کار اور سجا سجایا بنگلہ جہیز میں مانگنے لگے۔ ادھر لڑکی والے قیمتی زیورات اور ملبوسات کے علاوہ لاکھوں روپے مہر کے نام پر طلب کرنے لگے۔ غلط رسمیں چل نکلیں' عام ہوگئیں تو بوتل کا جن باہر نکل آیا۔ گرج کر بولا ''لوگ کیا کہیں گے؟'' ایسے ہی ہوتا چلا آیا ہے۔'' ''خاندانی روایات ہیں بزرگوں سے چلی آتی ہیں۔'' بوتل کے جن کی گرج کافی نہ تھی لہٰذا لوٹے سے دکھاوے کی چڑیل بن سنور کر باہر نکلی۔ ''ارے واہ وا بھی تو کروانی ہے''۔ بیچ میں اچھل کود کرتا ہوا ایک چھلاوا آ کھڑا ہوا۔ شاعرانہ لہجے میں بولا۔

؎ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

ٹھاٹھ باٹھ' دکھاوے' ٹہکے' بحث مباحثے' گرما گرمی اور سردا سردی کا چورن کھایا تو کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ یہ مقروض تھا وہ بوجھل۔ جس قوم میں ''دیکھو فلاں لوگوں نے بھی تو یوں کیا تھا'' اور ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں'' کا چلن عام ہو جائے اس قوم کے سب کام بگڑ جاتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی شادی کی تو صاحبو! اس طرح کی لپاڈگی میں کبھی گڈی کٹ جاتی ہے' کبھی پھٹ جاتی ہے یا کبھی مانجھا ٹوٹ جاتا ہے ہتھے سے۔ بوتل کے جن' لوٹے کی چڑیل اور دوست احباب تنہائی میں اچھل اچھل کر اور محفلوں میں ذرا احتیاط کے ساتھ تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ گڈی اڑی یا ٹوٹی بزرگوں نے اعلامیہ جاری فرمایا کہ شادی بیاہ تو دراصل آسمانوں پر ہوتا ہے صرف اس کی تقریب زمین پر منائی جاتی ہے۔ واہ! تو پھر مناسب جوڑ کی تلاش' کاوش چہ معنی دارد؟ بیس برس ہوئے ہوں گے لتا منگیشکر کا انٹرویو نشر ہو رہا تھا۔ جب شادی کا ذکر آیا تو لتا بولیں' ''شادی بیاہ کا سنجوگ تو آسمانوں پر ہوتا ہے''۔ اپنے عقیدے کے مطابق انہوں نے بجا فرمایا۔

ایک اور نکتہ قابلِ غور ہے۔ ہمارے فقیہوں کو لمبے چوڑے الفاظ استعمال کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ ''حق مہر شرعی مؤجل بتیس روپے چھ آنے سکہ رائج الوقت!''

؎ قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

تو صاحبو! ترکِ قرآن تو وہیں ہوگیا جب کتابِ حکیم کے تجویز کردہ ''دولہا کی حیثیت کے مطابق'' کا حکم ویٹو کر دیا گیا۔ شادی امریکہ میں ہو تو سکہ رائج الوقت وہی بتیس روپے چھ آنے یعنی پچاس سینٹ بنے گا کیونکہ ذکر ہے رائج الوقت کا نہ کہ رائج المقام کا۔ عربی کا مقولہ ہے کہ جاہل اعتدال پر کبھی قائم نہیں رہتا یا افراط کا شکار ہوتا ہے یا تفریط کا یعنی حد سے بڑھ جاتا ہے یا حد سے گھٹ جاتا ہے۔ اگر فقیہہ شہر اپنے ہی مقرر کردہ شرعی معیاروں پر قائم رہے تو امریکہ میں پچاس سینٹ مضحکہ خیز ہو جاتے ہیں اور اگر آنجناب ایک تولہ سونے کی قیمت بطور مہر تجویز فرمائیں تو چند ڈالر ہو جائیں گے۔

؎ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

نتیجہ یہ نکلا کہ فقیہانِ حرم نے ''اس طرح تو ہوتا ہے'' پر چلتے ہوئے لوگوں کی خواہشوں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ہزاروں ڈالر مہر کی ڈیمانڈ ہوئی تو وہ مسکرا کر رہ گئے۔ شیریں تحفے کی روح کھینچ لی گئی۔ زیورات وملبوسات جو اصل نحلہ تھے ان کے علاوہ دولہا کو مال کی رسی سے باندھنے کی کوشش ہونے لگی۔ ''مہر باندھنا'' واہ! کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی صاحبو! لیکن جگہ ختم ہو رہی ہے۔ مہر کی دو قسمیں بنائی گئیں۔ مؤجل یعنی ملتوی کیا ہوا اور غیر مؤجل یعنی فوری ادائیگی۔ اس بحث کا موقع نہیں۔ شاید یہ کالم ہمارے نوجوانوں کو روشنی عطا کر جائے۔ کیونکہ ''اس طرح تو ہوتا ہے'' کہنے والے بزرگوں کی سمجھ میں یہ گزارش نہ آسکے گی۔ فی امان اللہ!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نذیر ناجی

غیر سیاسی وزیراعظم

بھارتی وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے مقبوضہ کشمیر کا مجوزہ دورہ ملتوی کر دیا کیونکہ بھارت کے انتخابی قوانین کے تحت اس علاقے میں جہاں انتخابات ہونے والے ہوں کوئی حکومتی عہدیدار یا افسر ایسی پالیسی یا اقدام کا اعلان نہیں کرسکتا جس میں عوام کو سہولتیں پیش کی گئی ہوں۔ من موہن سنگھ مجوزہ دورے میں کچھ اہم اقدامات کا اعلان کرنا چاہتے تھے مگر جب انہیں بتایا گیا کہ مقبوضہ کشمیر کے کسی حلقے میں الیکشن ہونے والا ہے تو انہوں نے اپنا یہ دورہ ملتوی کر دیا۔ اب وہ انتخابی عمل ختم ہونے کے بعد دورے پر جائیں گے۔ من موہن سنگھ جب وزیراعظم بنے تو ان کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ کانگریس اور اس کی قیادت کے اشاروں پر کام کریں گے۔ ان کی حیثیت کٹھ پتلی وزیراعظم کی ہوگی جبکہ اصل اقتدار سونیا گاندھی اور ان کے نورتنوں کے پاس رہے گا۔ اتفاق سے پاکستان میں بھی ایک ٹیکنوکریٹ وزیراعظم بنے ہیں اور ان کے بارے میں بھی وہی باتیں کی جارہی ہیں' جو ڈاکٹر من موہن سنگھ کے بارے میں کہی گئیں۔ وہ بھی غیر سیاسی شخصیت ہیں' انہیں بھی ایک طاقتور لیڈر نے نامزد کر کے پارلیمنٹ میں اکثریت دلائی' وہ بھی سیاسی تائید و حمایت کے لئے اپنے سرپرستوں کے محتاج ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی اہلیت' اصولوں' دیانتداری اور مراعات و مفادات سے بے نیازی کی بنیاد پر آزادانہ طریقے سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی دیانت کی قوت اتنی ہے کہ کسی کو ان کے معاملات میں مداخلت کی ہمت نہیں پڑتی۔ ڈاکٹر من موہن سنگھ کی سو دنوں کی کارکردگی سے اندازہ کیا جا رہا ہے کہ وہ کسی کا دم چھلا بنے بغیر اپنی دیانت اور اہلیت کے بل بوتے پر' اپنے آئینی اختیارات کے استعمال میں پوری طرح آزاد رہیں گے۔ اب تک کے تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ وہ حکومتی معاملات میں پارٹی بازی سے بالاتر ہیں' ان کی حمایت کرنے والی کولیشن میں شامل بیشتر بڑی جماعتوں کو احساس ہونے لگا ہے کہ وہ ان کی بات نہیں مانتے۔ سب سے زیادہ شکایت کانگریسیوں کو ہے۔ جھاڑکھنڈ میں کانگریس کے ایک لیڈر کے عدالتی وارنٹ نکلے تو انہیں گرفتاری سے بچانے کی کوشش کی گئی لیکن وزیراعظم نے حکم دیا کہ وہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرے۔ یاد رہے کہ اس ریاست میں بی جے پی کی حکومت ہے' کولیشن میں دوسرا بڑا گروپ کمیونسٹوں کا ہے۔ انہوں نے بجٹ کے موقع پر سیاسی نعرے لگانا شروع کئے تو من موہن سنگھ نے انہیں بلا کر کہا کہ ''تقریروں سے کام نہیں

چلے گا' اگر آپ حکومتی امور میں سنجیدہ ہیں تو کچھ لو اور کچھ دو کا اصول اپنانا پڑے گا'' بجٹ اجلاس میں بی جے پی نے ہنگامہ آرائی کی تو ڈاکٹر سنگھ نے ایل کے ایڈوانی اور جسونت سنگھ سے کہا ''اگر آپ اجلاس کی کارروائی نہیں چلنے دیں گے' بحث نہیں کریں گے اور پارلیمانی کمیٹی کی کارروائی میں حصہ نہیں لیں گے تو ان سب باتوں کا فائدہ کیا؟'' جب کوئی وزیر ان کے سامنے لمبی بات کرنے لگتا ہے تو وہ اسے ٹوکتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''تیاری سے آیا کریں پلیز'' پلیز کہنے کے انداز سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ بے مقصد باتوں پر ناراض ہیں۔ وہ اپنی توجہ کام پر مرکوز رکھتے ہیں۔ قومی اور ملکی امور میں پارٹی کی ضرورتوں اور ذاتی پسند اور ناپسند کو اثر انداز نہیں ہونے دیتے اور جب کوئی اعتراض ہوتا ہے تو وہ اطمینان سے استعفیٰ کی پیشکش کر دیتے ہیں۔ نرسمہا راؤ کے دور میں ٹوکے جانے پر انہوں نے دو مرتبہ استعفیٰ پیش کر دیا تھا۔ کانگریس قیادت کو ان کے اس مزاج کا علم ہے' سونیا اور من موہن سنگھ میں ایک عجیب وغریب تقسیم کار یہ ہے کہ سرکش اور سودے بازیاں کرنے والے سیاستدانوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری سونیا گاندھی نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ جبکہ سیاسی ضرورتوں کے تحت کابینہ میں شامل ہونے والے سیاستدانوں سے ڈاکٹر من موہن سنگھ کا واسطہ صرف امور مملکت کی حد تک رہتا ہے۔ جب کوئی وزیر سیاسی مطالبات پیش کرتا ہے تو وزیراعظم اسے سونیا گاندھی کے گھر کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔

من موہن سنگھ بیوروکریسی کو نہ خود دباؤ میں لاتے ہیں اور نہ ہی اس کے دباؤ میں آنا پسند کرتے ہیں۔ وہ انتظامی سائنس کے جدید اصولوں کے تحت ہر ایک کو اپنے اپنے مقرر دائرے کے اندر ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ ایک بیرونی دورے پر جانے سے پہلے جب انہیں بریفنگ دی جانے لگی تو انہوں نے چند ہی جملوں کے بعد متعلقہ افسر سے کہا ''یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھے وہاں کیا کہنا ہے؟ یہ بتائیے کہ وہاں مجھے کیا کچھ جاننا ہے؟'' من موہن سنگھ ہر وزارت کے معاملات کی پوری تفصیل جاننے کے بعد اس پر خود سوچ بچار کرتے ہیں اور پھر متعلقہ وزیر سے کئی کئی گھنٹے تک تبادلہ خیال کر کے پالیسی کے بنیادی خدوخال متعین کرتے ہیں۔ بجٹ سے پہلے وزیرخزانہ چدمبرم (Chidambaram) کے ساتھ انہوں نے مجموعی طور پر قریباً بیس گھنٹے اور WTO کے اجلاس میں شرکت کے لئے جانے سے پہلے صنعت و تجارت کے وزیر کمل ناتھ سے سات گھنٹے تک تبادلہ خیال کیا۔ کابینہ کی تشکیل سیاسی ضروریات کی بنا پر ضرور ہوئی لیکن عملاً ڈاکٹر من موہن سنگھ ایک مؤثر اور فعال حکومت چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ان کے سامنے کسی کو احتجاج یا شکایت کا بھی حوصلہ نہیں ہوتا کیونکہ جو کچھ وہ دوسروں سے مانگتے ہیں اس سے زیادہ خود کرتے ہیں۔ کام بھی اور دیانتداری کا مظاہرہ بھی۔ وہ ایک بیرونی دورے پر گئے تو بیوی سے کہا کہ شاپنگ کے لئے اپنے ساتھ لائی ہوئی کرنسی تبدیل کرا لو۔ جب سرکاری عملے نے بتایا کہ ان کے سرکاری الاؤنسز کی رقم موجود ہے تو ڈاکٹر من موہن سنگھ نے انہیں منع کرتے ہوئے کہا کہ ''سردارنی کو اپنے پاس سے خرچ کرنے دو'' جب وہ

وزیرخزانہ تھے تو ان کی بیٹی کی ایک کلاس فیلو نے نوٹس مانگے' کالج میں اس کے پاس نوٹس موجود نہیں تھے۔ سہیلی نے کہا کہ گھر جا کر وہ یہ نوٹس اسے فیکس کر دے' ڈاکٹر من موہن سنگھ کی بیٹی کا جواب تھا ''ہمارے گھر میں سرکاری فیکس ہے' میں نوٹس کل ساتھ لیتی آؤں گی'' ایسا کردار رکھنے والے وزیراعظم کے سامنے کون سا سیاستدان پر مارے گا؟

عام قارئین کے علاوہ میں نے یہ کالم وزیراعظم شوکت عزیز کے لئے بطور خاص لکھا ہے ان کے ساتھ عموماً ڈاکٹر من موہن سنگھ کی مثال دی جاتی ہے اور اسی حوالے سے عوام انہیں امید بھری نظروں سے دیکھ بھی رہے ہیں۔ مثال میں نے ان کے سامنے رکھ دی ہے۔ اگر وہ عوام کی امیدیں پوری کرنا چاہیں تو نہ ان کا غیر سیاسی ہونا کوئی رکاوٹ بن سکتا ہے نہ اختیارات کی تقسیم کوئی مسئلہ پیدا کر سکتی ہے اور نہ ہی وزیروں کا سیاسی اثر و رسوخ کارکردگی کو متاثر کر سکتا ہے۔ دیانت اور شفاف کارکردگی سے بڑی طاقت کوئی نہیں ہوتی۔ یہ طاقت شوکت عزیز کے پاس موجود ہے۔ وہ اس طاقت کو استعمال کرنا چاہیں تو پڑوسی ملک کے وزیراعظم سے سبق لے سکتے ہیں۔

مشکل تو ہر کام ہے لیکن
کرنے والے کر جاتے ہیں

(بشکریہ روزنامہ جنگ' 14/09/2004)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم شوکت عزیز صاحب وزیراعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان

عنوان:۔ غریبی کا خاتمہ۔خزائن الارض اور سپاہ ربوبیت

السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

محترم! بحیثیت وزیراعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے منتخب ہونے اور حلف اٹھانے پر آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کو اس سے پہلے بحیثیت وزیرخزانہ 10 جون 2003ء ایک خط لکھا تھا جس کی کاپی منسلک ہذا ہے۔

حضور والا! حضرت یوسف علیہ السلام نے والئی مصر سے کہا تھا:

قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم (12/55)

(یوسفؑ) نے کہا تم زمینی خزانوں (پیداوار۔معاشی معاملات) کو میری تحویل میں دے دو میں ان کی حفاظت کرنا، ترقی دینا اور مستحق تک پہنچانا جانتا ہوں (میں نبوی بصیرت سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے)۔

آج زمینی پیداوار خزائن الارض میں نہری نظام، ڈیم سازی، گیس، تیل، سنگ مرمر، نمک، چونے کا پتھر، زمینی معدنیات سب کچھ آجاتا ہے۔اگر اس سے ایک فیصد بھی غریبی مٹانے پر لگایا جائے تو مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔

حضور والا! اللہ کی صفت رب۔رب العٰلمین (7/61)۔رب العٰلمین (28/30) پر ایمان ہی سے دوسروں کی ربوبیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔جس کا جیتا جاگتا سب سے اہم اور بڑا ماڈل حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ۔خلق عظیم اور رحمتہ اللعٰلمین ہے۔اللہ جل جلالہٗ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والا ربانی مسلم بن جاتا ہے۔آیئے ہم اسی جذبہ سے یونین کونسل کی سطح پر ربانی کونسل تحصیل اور ضلع کی سطح پر ایوانِ ربوبیت اور ملکی سطح پر دانشورانِ ربوبیت پیدا کر کے سپاہ ربوبیت کی تشکیل کریں اور یونین۔ تحصیل اور ضلع کی سطح پر ربانی لنگر خانے قائم کردیں تاکہ کوئی بھوکا نہ رہ سکے۔

انگریزی عملداری میں بنائے گئے مزارعت کے نظام کو ختم کر کے کاشتکاروں کو حقوق دیئے جائیں۔بنجر زمینوں کی آبادکاری کا پروگرام بنایا جائے۔اور زرعی پیداوار میں عشر کا نظام نافذ کر کے غریبی کو ختم کرنے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ے ہے خُوب اگر دِل میں اتر جائے مری بات

اگر آپ کو مزید معلومات درکار ہوں تو پیش خدمت کردیں گے۔

والسلام

ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیو مری۔

DOES *ALLAH* CONTROL WEALTH?

An Excerpt Chapter from the Translation of

Kitab-ut-Taqdir By G. A. Parwez

English Rendering By
Khalid Sayyed, UK.

==========

The idea that *Allah* directly controls the distribution of wealth is the most damaging, of all generated by the concept of Compulsion. It is believed that : *Allah* makes individuals (as well as peoples) rich or poor at His own sweet will. The poor must not feel jealous of the rich. To desire to acquire somebody else's wealth tantamounts to complaining against *Allah*'s decision. That is dissent.

In Praise of Poverty

One must be content with whatever state *Allah* keeps one in. To unflinchingly accept *Allah*'s will is the way of His chosen people. Contentment is an invaluable asset. *Allah* likes penury. The worldly wealth is like dead meat and only dogs desire it. It may be possible for a camel to pass through the eye of a needle but not for the wealthy to enter the Kingdom of Heaven. Messengers of *Allah*, saints, exalted men, were all poor. The Messenger of *Allah* (Muhammad) says: "Poverty is my pride". Elsewhere, he says: "Islam originally flourished among the poor and so it shall in the end". *Baba Fareed Ganjshakar* (a saintly figure of yesteryears' sub-continent), when complained to, of poverty, by one of his followers, took him to a pond of water. Lambs who had sated themselves with water were having a deep snoring sleep, whereas the thirsty ones were desperately trying to get water. The saint told the follower: "Do you see, son, the difference of wealth and poverty? The wealthy become careless of *Allah* but the poor keep in constant touch with Him. "

Such are the anecdotes popularized by the religious to lull the poor to sleep so that they remain oblivious of all the exploitation committed against them by the rich. The entire concept is anti-Quranic, but it is said to be supported by the Quran! Let us see what Quran really says in this regard.

The Arabic word *rizq* (رزق) refers to means of livelihood (necessities of life). In addition to *rizq*, the Quran has used terms like *fadl* and *ma'ash*.

The position of *rizq* is the same as that of guidance, treated in detail in the previous chapter. That is, *Allah* has said that: "We have sent you (men) on Earth which is well supplied by the means of your livelihood. Heat, light, air, water and

food were all here even before your arrival ("We give your sustenance"). But just like our guidance, you need to work to obtain the necessities of your life. We have formulated certain laws about that, too. Whoever strives accordingly, shall get wealth. Birth of a human child is simultaneous to production of milk in the mother's breasts, but, if the mother abandons the child, it will die of hunger – We do NOT feed him even a single drop! Just look at Our system. Initially, mother's milk is more watery than fatty to suit the infant's digestive capabilities. Gradually, however, mother's milk becomes fattier until the time comes when the child has teeth and is able to digest other food. Mother's breasts go dry. Now, parents have to work to get food for the child.

So much for *'rizq* given by *Allah*' on the individual level. On the group-level, the situation is not very different. Our planet, Earth, contains wealth in raw form.

Distribution of Wealth

Man has to find and retrieve it. This takes place under natural laws (formulated by *Allah*). In the first instance, personal work is required. Later, the question arises of distributing the wealth so obtained in a social context. This is where the situation gets complicated. It is here that Man needs *Allah*'s guidance. If *rizq* is distributed in the light of *Allah*'s guidance (the System of Providence), every individual gets sustenance peacefully and with self-respect. Otherwise (if *rizq* is distributed under a man-made system), society becomes a living Hell (as is the current situation of the globe). Let us see what the Quran says about it all.

1. '*Allah* Gives you Sustenance' واللہ یرزقکم

Allah says in the Quran: "There is none among the living on Earth whose sustenance is not upon Allah*"* (11/6); elsewhere, Man and other creatures are mentioned separately (29/60); Sura *Rome*: "*Allah* is the one who creates you all and then provides you sustenance" (30/40); *Sura An'aam*: "We sustain you and your off-springs" (6/152; 17/31).

This provision of sustenance by *Allah* is not done directly by Him because not only other creatures but also men die by the millions in a famine. The current distribution and availability of food to Mankind on this planet is a living contradiction of the view that *Allah* carries out this responsibility directly. It really means that He has created the means of wealth -- "We put you in place on the Earth and for you made in it means of Sustenance" (7/10; 15/20). Earth has been given the potential of producing food. He sends down rain which helps to produce food -- "*Allah* is the one who created the skies and the Earth, and sends down from the sky

rain and so brings out from it a variety of sustenance for you" (14/32); "He provides sustenance for you from the sky and the Earth" (35/3); also: (2/22; 10/31; 27/64; 34/36; 40/13; 45/5; 50/11; 51/22; 80/25-32); "Who can provide you food if *Allah* turns these sources of sustenance off?" (67/21; 63/30; 56/63-73). "The Earth has an infinite potential of yielding food, but at a given time, only a finite amount may be obtained -- And We have stores of every thing but We don't send those down (bring out of the Earth) except according to known measure" (15/21). The term 'known measure' (قدر معلوم) clearly refers to established ways and means (natural laws) open to Man's discovery and application. Elsewhere in the Quran, it is referred to as of His plan (ما یشاء); "the reason for restricted yield of food is to check greedy oppressors among men" (42/27).

Having seen the 'known measure', let us move one step further.

2. Conditions for Obtaining Sustenance

The equation of natural resources and human effort to obtain sustenance has very eloquently been presented in *Sura Waaqea*:

> "Consider your contribution against Our laws in agriculture. You plow a field and sow seeds. Who produces crops from seeds, you or We?
>
> Who looks after crops? A calamity may fall and destroy a crop, leaving you shocked and sympathizing with your fellows and agonizing over the comprehensive loss of not only crops but also of seeds and hard work!
>
> Consider water which is essential not only for crops but also for your own existence. Do you bring it down from clouds or do We? Clouds are formed from salty sea-water which is unusable for either farming or your own consumption. What could you do if rain-water was as salty? Why can't you arrive at the right conclusion in such a clear and simple matter? Why can't you appreciate *Allah*'s system?
>
> Consider fire which you use in so many ways. Who has caged heat (in firewood) in that manner? You or We?
>
> We have created all this (you only provide work). We state these facts to remind you of that forgotten truth that We have put all this, in place so that the needy get sustenance." (56/63-73)
> (From *Mafhoomul Quran)*

In the early part of mankind's life, food comprised mainly the hunted animals and general natural produce of the earth. Then came the era of human handiwork. But, manufacture depends on raw material obtained from the earth. Therefore, the earth is the primary source of all sustenance (wealth).

Wealth included in *rizq*

The early period of human civilization saw the Barter System as the established way of trading. Later, coins were invented whereby precious metals (gold, sliver) were used to buy necessities of life. Thus wealth (money) acquired purchasing power which started a series of complications of ever-increasing complexity. From then on 'Obtaining Sustenance' was taken to mean money/ Wealth as well as 'obtaining food'. So much so that in the present age, obtaining sustenance from the earth has become secondary to earning wealth. Money is the measure of richness and poverty as well as the reward of labor. The 'potential of earning' (making money) means human intelligence, knowledge, experience, ability to understand and use the economic and monetary system, and least of all, work. Work is not always a factor!

Search for Sustenance

The Quran declares desire and work as fundamental to obtaining *rizq*. It is termed as "ابتغاء فضل الله": the search for divinely-gifted sustenance. The Quran cites the revolutionary movement of Earth to create day and night as one of His signs; they have been made bright "so that you can search your Preserver's bounty *(rizq)"* (17/12). Incidentally, the expression 'ابتغاء' refers to search as well as intention (plan), effort and achievement. With regards to search for sustenance, a special mention is made of boats which were the best means of transportation at the time. Sea-vessels are quite important even today. "You see the boats sailing briskly in sea so that you can search His bounty" (16/14); also: (30/46; 35/12; 45/12). This search for sustenance is necessary for the convinced and the dissenters alike. Hence, one of the characteristics of the Messenger and his group is that "They search *Allah*'s bounty (and His approval)" 48/29; 73/20). It even becomes obligatory for the convinced: "When you have finished *as-Sala*, spread in the earth and search *Allah*'s bounty" (62/10).

As a result of this effort, sustenance will come according to natural laws, which make no distinction between Muslim and non-Muslim. Whoever farms under the right agricultural laws shall reap a good harvest. The Quran explains it all: "Whoever wants to have short term benefits gets them according to Our plan established by Our will; and whoever desires and strives for long-term benefits as well, and is also convinced of Our message, gets his efforts produce results; We

bestow from your Preserver's bounty, according to everyone's effort; your Preserver's bounty is not forbidden (or restricted) to anyone" (17/18-20). *Sura Shora* reiterates this fact thus: "Whoever wishes benefits of future gets his crop yield more by Us; and We give, according to one's effort, short-term benefits to the one who so desires, but they don't get anything in future" (42/20). That, then, is the Divine Law (Plan -- مشيئة) governing the distribution of *rizq*: "Whoever (individual or group) ignores Our laws shall have(or its) sustenance restricted" (20/124), and then goes on to say: "and We will have him (or them) raise blind on the Day of Judgment". It is clear, therefore, that *rizq* gets available to anyone who works according to natural laws. This is the principle sent to mankind through each and every messenger of *Allah*. The Quran says about the Jews and the Christians of the time that: "If they had kept to the Tora and the Bible, and whatever *Allah* has sent down, they would have had plenty of *rizq* (from 'up and down')" (5/66; 7/96) Such abundance of *rizq* is termed as *Allah*'s favor and bounty. It was said about the tribe Quresh that they should accept and follow the system of the Preserver of *Kaaba* who 'gave them food to satisfy hunger and protected them from fear" (106/4). Contrary to this, hunger and fear have been called *Allah*'s punishment.

Hunger is *Allah*'s Punishment

> *Sura Nahal* says: "*Allah* explains it with the example of a township. It was in peace and contentment. *'Rizq'* came to them in plenty from all four directions. They denied and rejected these bounties of *Allah*. So, *Allah* had them taste the calamities of hunger and fear. It was all due to their own deeds!" (16/112).

Similarly, it talks about the people of *Saba*. They were prosperous but ignored to take proper care of their crops and orchids. So, they were all destroyed (34/15-16).

Respectable Sustenance

Then the Quran goes on to say that when men face shortage of sustenance, they blame *Allah* for afflicting them without cause. It is said, "Tell them that *Allah* doesn't degrade anyone without due reason. It is all because of Man's own wrong system and errors of deeds. You did not accord due respect to the lonely of society; you did not arrange to feed the hungry and were greedy. That is why you were destroyed: (89/16-20). Since hunger and degradation are *Allah*'s punishment, one characteristic of the convinced (مؤمنين) is that they get respect- able sustenance (as well as Protection) (8/74); also: (8/4; 22/50; 33/31; 34/4). This respectable sustenance was desired even by *Allah*'s messengers. The founder of *Kaaba* – The first-ever House of Allah – wished, after having just completed the task of erecting the sacred cubicle:

"O Allah of Universe! I have settled my progeny in this barren land so that they look after Your House. Please see that they keep getting sustenance and never remain hungry" (14/37; 28/57;2/126).

That is 'The food from the sky' requested for his followers by Christ (5/114).

We have seen that *rizq* is available to anyone who strives for it. But, the fact is that we observe someone who struggles very hard but remains poor and his family goes hungry. On the contrary, someone doesn't do any work but lives in prosperity and comfort. Why is that? Let us see.

3. Distribution of *rizq* (The Economic System)

We shall now look at the intriguing question raised above: Why do some remain destitute despite bone-shaking hard work and others enjoy affluence without doing any work at all?

Riches and Poverty

Hindu mythology finds the answer in reincarnation: One's present financial state depends on the kind of life one has had in the previous one. This state of affairs is unchangeable since it is deemed by *Eshwar Paramatma*, the Supreme God.

The Quran's answer

The Muslim preacher explains it through pre-destiny. Richness and penury are directly ordained by Allah. Destiny is unchangeable no matter how hard one tries. But the Quran says: It is all because of their deeds! It is all because of the unfair economic set-up humans have adopted. Armed robbers pick-pockets and thieves, for instance, deprive people of their hard earned wealth. On the group level, the thievery and robbery are less visible -- a feudal land-owner or an industrialist exploiting the hard-work of the farm-workers and factory-workers, respectively. There are some intriguing questions, regarding the economic system we currently have, nobody bothers to think about, let alone try to answer – Who fixes the rate of payment for a farmer, laborer, etc.? How is it done and on what basis? Who controls prices, and on what basis is it done?

Obviously, it is all done by men. Destiny, reincarnation, etc. have absolutely nothing to do with it. *Allah* does not distribute wealth directly. He has provided Man with *rizq*. But, the fair distribution of it is to be done by Man not by *Allah*! If it is done according to the system suggested by *Allah*, no man will go without sustenance.

On the other hand, if it is done according to man-made systems, human society will turn into a den of beasts!

Quran's Economic System

It is not the right place to go into the details of the Quranic Economic System. I have treated this very important subject in detail in my works like *Nazaam-e-Rubobiyat* (The System of Providence), *Khuda aur Sarmayadar* (God and the Capitalist), etc. Here, I shall confine myself to a few fundamental points.

(i) The Earth, the basic source of sustenance, is to provide necessities of life to all men. The question of private ownership of land, therefore, does not simply arise. The Quran calls it *Allah*'s earth (11/54); "Everything in it has been created for you all" (2/29); "We have produced in it for you all means of life" (7/10; 15/20); it is "sustenance for people" (50/11); therefore, it should remain accessible to all the needy (41/10).

The 'owners' of land today have simply inherited it from past men and their unfair system. In the Quranic system, land belongs to no one. It is in the custody of society (government or state) which organizes a system which yields optimum produce which is distributed fairly on the basis of need.

(ii) Money was invented to replace the barter system to make life easier. People began to hoard money and use it to exploit their fellow men. In economic terms, capital replaced work as the basis of return. This is the capitalistic system of economy in which money generates money. In Quranic terms, this is usury (interest) which is 'declaration of war' against the Quranic economic system (2/275-279).

In very clear terms, the Quran has dubbed hoarding of wealth as gathering fuel for the hellfire in which humanity is burned to ashes (9/34-35; (70/15-18). Money should circulate in society, not among just the upper strata but like blood circulates in the body (59/7). Thus, in the Quranic society, no one ever possesses money (wealth) more than what is needed (2/219).

(iii) The capacity of producing sustenance (wealth), i.e., work varies from person to person. This difference should be used to have various social functions performed conveniently and usefully. This is called 'division of labor' (43/32). Individuals should work according to their various capacities and the produce should be distributed on the basis of need (16/76; 16/53). It is inhuman capitalism (represented in the Quran by the ancient Egyptian capitalist *Qaroon* in the *Pharoanic* court) in which the concept of keeping

one's earning to oneself thrives (28/78). This mentality is the cause of all problems and chaos (39/49).

(iv) The *Quranic* economic system is put in place by a government which is committed to implement *Allah*'s laws. It is called 'The Islamic State', in which men fulfill *Allah*'s promise of 'giving *rizq* to you as well as your progeny'. In this state no individual goes without the necessities of life nor anyone possesses wealth more than what is needed.

(v) Such a state is established by men who 'sell their selves and wealth in return for a promise of paradise' (9/111). Here (in this physical life) this 'paradise' is materialized by the Islamic State and in the hereafter it is done according to *Allah*'s plan (مشیئة).

That, then, is the system in which no one is complainant of their 'destiny' for want of unfulfilled needs. No individual is dependent upon, or in bondage to another individual -- everyone gets *'rizq'* with respect. Sustenance is no doubt provided by wrong (anti-Quranic) systems, but in these, the prosperous 'haves' become intoxicated with power resulting from affluence achieved without having to work for it. That destroys the society (28/58); the low-income groups fall natural prey to ills of poverty -- the ills which 'restrict sustenance and they are raised on the Day of Judgment blind (20/124; 17/72). Contrary to this, the *Rizq* obtained according to *Allah's* laws is 'good and lasting' (20/131). Individuals get more than they work for, i. e., all their needs are met. Such a society is established so that "*Allah* gives them the return of their deeds in a better way, and even more from His bounty"; thus *Allah* gives, according to His plan, without estimates (more than you can think of in your terms!) (24/38). That is why *Allah* calls Himself 'the best of all sustenance providers' (23/72; 62/11).

Let us now try to see who among men are likely to establish such a state and how.

4. He Gives Sustenance Beyond Estimate

We have just seen that:

a) *Allah* created Man and provided him the sources and means of sustenance.
b) but sustenance can be obtained only by working according to *Allah*'s (natural) laws,

c) the distribution of sustenance thus obtained is quite an important matter; it can be dealt with neither through natural laws nor human intellect; it requires Revelation, i.e., divine guidance,

d) Laws of Nature and Laws of Revelation are both termed as 'مشیئۃ اللہ' (*Allah*'s Plan), i.e., laws which *Allah* has formulated and established, through His own exclusive discretion, for human society.

e) In regards to *rizq*, whenever the Quran uses the phrase 'من یشاء' the context will decide the subject (*Allah* or Man) of the sentence. When the subject is *Allah*, it means sustenance is made available according to *Allah*'s Plan. When the subject is Man it means whoever follows *Allah*'s laws shall thrive; whoever chooses to go against His laws, shall fall into destruction and degrading poverty.

What من یشاء really means

Sura Zumr talks about the mentality represented by *Qaroon* (*Korah* of the Bible) and says that Man is a strange creature. When he is in a problem, he calls out to *Allah* for help, but when he is prosperous he becomes arrogant and credits his own self exclusively for his gains. This mentality is the root of all evils in human societies. Unfortunately, most men are not aware of it. This mentality is by no means restricted in numbers or time. This is the capitalistic mentality. History provides testimony to the sad truth that this is a destructive mentality – 'calamities came to them because of their own deeds; and whoever among these (your people O Messenger) transgress, shall bring upon themselves calamities because of their own deeds! (39/51).

The Quran goes on to say: "Don't they know that *Allah* increases sustenance or scales it down for whoever so desires? This contains signs of truth for people who are convinced (of *Allah*'s laws)" (39/49-52). If the subject of phrase 'من یشاء ' is taken to be Man (which is my preferred view), it means whoever strives according to natural laws, gets a corresponding amount of sustenance. If the subject is taken to be *Allah*, it means that increase and decrease in sustenance occur under *Allah*'s Plan (مشیئۃ).

***Korah's* examples**

Sura Qasas illustrates this reality by the example of *Korah (Qaroon* in the Quran). When people, who used to feel envious of *Korah's* riches, witnessed his plight, said: "Certainly, the increase in sustenance for His people is done by Him according to scale for whoever so wishes" (28/82).

Sura Rome: "When We (give a) taste of bounty to men, they are very pleased by it, but when calamity comes to them due to their own deeds, they get frustrated. Don't they see that *Allah* increases or scales down sustenance for whoever so wishes? Surely, in this are signs for the Convinced" (30/36-37).

Sura Ra'ad talks about men who violate the contract they have had with *Allah* by dividing up mankind in groups, are destined for destruction -- "*Allah* increases or decreases *rizq* according to His Plan –" (13/26).

Sura Beni Israel talks about good social behavior and says: "Certainly, your Provider increases or decreases sustenance according to His Plan (مشیئة)" (17/30-33).

What is Anfaaq?

A society established on Quranic principles has its economy based upon *Anfaaq* (proper spending for greater good of society). This Quranic term is quite meaningful. Its basic root is n-f-q (ن ف ق). In the older days, money was usually stored in string purses (with only one opening). *Naifaq* was a purse with two openings. This should explain *anfaaq*, i.e., an economic system in which money keeps flowing and is available to all the needy. This availability must be 'in *Allah*'s way' (سبیل اللہ), i.e., keep one's earnings available for the needy entirely free of any charge. Therefore, *Sura Baqara* says: "They ask you how much they should keep available. Tell them: all which is over and above your needs! (2/219). Such an economic system has been compared to a good crop which yields hundred-fold from just one seed. Verses 261-267 of *Sura Baqara* sing praises of *anfaaq* in *Allah*'s way. Elsewhere, it is referred to as 'giving a loan to *Allah'* which is repaid with huge returns (2/245). *Sura Saba* says: "Tell them that increase in, and scaling down of sustenance is done by my Preserver for His People according to His Plan. Whatever you spend properly, will come back (many-fold); and *Allah* is the best of sustenance providers" (34/39).

Sustenance 'without estimates'

We have seen that there are two aspects of increase / decrease in sustenance *(rizq),* i.e., to obtain it from the earth according to natural laws, and to distribute it according to permanent values established by *Allah*. This will ensure *rizq* 'beyond calculations' (بغیر حساب). We have also seen that 'without estimate' does not mean without regulation. It simply means that the result is beyond your (men's) expectations and estimates. It has been experienced in Pakistan. Until a few years ago, the old methods of farming yielded an average of 20-25 '*maunds'* (1 *manud* = 80 kg. Approximately) of wheat per acre of land. When the country adopted modern methods of agriculture (farm machines, special seed, fertilizer, proper irrigation,

etc.), the yield multiplied 4 to 5 times! But then the vices of the capitalistic system began to show. Price of wheat fell and that of other consumer goods rose. Less wheat sold and it started to be smuggled out of the country. Consequently, prosperity vanished and poverty came in. If the country had distributed this 'without estimate' *rizq* according to *Allah*'s guidance (as it had been produced), the society would have had 'rivers of milk and honey'. The Quran has quite comprehensively presented this fact. It says that when a society is administered by people who are not taken in by individual interest, they uphold *Allah*'s law by taking on the responsibility of providing sustenance (necessities of life) to people and are always mindful of the destructive consequence of a wrong economic system, the society is rewarded by *Allah* in a nice way due to their own deeds, and their wealth is increased by His bounty, and *Allah* gives limitless *rizq* to whoever so desires (24/38).

The Convinced of the First Era

The group of Muslims in the first era of Islam was economically not very well-off. Their opponents (Chiefs of the *Quraish* tribe) used to make fun of them that the destitute were hoping to overcome the Roman and Persian empires. *Allah* said in the Quran that they (the Quraish) simply did not know the reality. The group of Muslims had committed themselves to *Allah*'s Plan. As a rule, this plan initially requires a lot of hard work – hunger, destitution, loss of life and property, destruction of crops, etc. have to be faced (2/155). But, eventually, *Allah* gives limitless *rizq* according to His Plan (2/212). History stands witness to this in the case of the Muslims rising as a nation. They were able to say: "Verily, You give limitless *rizq* according to Your Plan!" (3/26).

By now, the Quranic concept of phrases -- من تشاء ، من يشاء -- should be quite clear. Nonetheless, I wish to cite two verses to further clarify their meanings. (1) *Sura Shora*: "*Allah* is kind and generous to His people. He gives sustenance according to His Plan -- whoever desires benefits of future (long-term), We increase his yield for him; whoever wishes to have immediate (short-term) gains, We give him that yield accordingly and he has nothing coming in future (because the distribution of rizq is not done according to *Allah*'s permanent values)" (42/19-20).
(2) *Sura Yaseen*: "When they (the Dissenters) are told to spend for greater good from whatever *rizq Allah* has given them, they say to the Convinced: Should we feed those who would have been fed by *Allah* if He so wanted?" The response was: "Surely, you are obviously not on the right track!" (36/47) meaning thereby that "*Allah* gives sustenance according to His Plan" means that men have to arrange for sustenance of men.

"*Allah* has made some of you better than others in *rizq*" (16/71).

Before moving on, I must explain two verses which, if seen superficially, appear to support the concept of Compulsion. One of the two is (16/71), given in part above. Apparently, it means to say that we observe that certain individuals and groups (nations) are more prosperous than others; therefore, the idea of Compulsion must be right. First of all, the true meaning of (فضل الله) (*Allah* has blessed) should be seen. This particular phrase like some others we have already seen, e.g., "*Allah* seals their hearts shut" simply means that His blessing with His bounty happens as a result of Man's deed and according to His established laws (the reader may recall verses 17-21 of *Sura Beni Israel*, which eventually says: "See how We better some than others") (17/21); the emphasis is on the how of it. It all happens as a result of men's actions.

We Distribute

The second of the two verses is 43/32 which appears (conventionally) to say: "In this world's life, We allocate people's means of living; and We upgrade some over others" (43/23). In principle, this verse should also be interpreted on the lines of - فضل - in the previous verse. After 'allocation', the use of the term 'upgrading' is made clear by the verse (6/133) which says: "All grading is done according to deeds". This is supported by other verses like *Sura Nisa* (The active have higher grades than the passive – (4/95); and (9/19): "Migrants and Strivers have high grades than water-suppliers to pilgrims or decorators of the Holy Mosque.

Two Basic Factors of Earning Sustenance

The reader may be reminded of the two constituent factors of obtaining sustenance from the earth: (i) the natural sources of Earth (light, heat, air, water, land, etc.) Which are available to Man absolutely free (*Allah*'s bounties). The Earth has a variety of climatic and geographical conditions affecting the production of *rizq*. Man has little or no control over these various conditions.
(ii) Man's input and it depends entirely on Man's will and effort.

Difference in People's Capacities and Abilities

The 'allocation' of *rizq* is dependent upon a combination of the two above factors. Regarding individuals, we commonly observe differences of capacity and ability, which are caused by the factors like the following:

(a) Certain mental disorders inherited genetically.
(b) Certain physiological disorders developed during pregnancy.

As pointed out earlier, these disorders and deficiencies are natural. Medical sciences are gradually progressing in their prevention and treatment. It is difficult to foresee a time when all individuals will have equal potential. However, the fact is that such medical conditions are in no way unchangeable destiny of individuals.

(c) The formative years (early childhood training, education and environment).
(d) The conditions available for children's development, i.e., schools, syllabi, healthcare, psychology, etc.
(e) The questions of supply and demand, and facilities available and their use, etc.

Obviously, the factors mentioned above pertain to society where an individual cannot control all of them. They are under compulsion by social restraint created and controlled by other men, not *Allah*! Since the establishment of a fair society has also been termed '*Allah*'s bounty' by the Quran, individuals getting benefits and advantageous position in such a society is also a 'bounty of *Allah*'. Therefore, earning of sustenance comprises the following two factors:

(1) Human input, and
(2) *Allah*'s bounty (either natural resources or social benefits)

Society is responsible

The question, then is: who is responsible for an individual or a group falling behind others in life as a result of shortage of 'Allah's bounties'? The Quran holds human society responsible for it. In a Quranic society, the variance in status, or conditions in general, are too small to matter. The Quran proposes a global united fraternity of men. In a divided world, every group tries to get ahead of others, by hook or by crook (16/92). In a globally one society, people who may have better 'bounties' than others do not oppress other men: "He is the one who gave you succession of the Earth, and what you've been given!" (6/166). In a fair system, *Allah*'s bounties are used for universal good: "Whatever is good for (all) mankind, shall survive and stay on Earth" (13/17).

Regarding individuals, the Quran proposed a system in which they are not affected by the difference in capacity and ability. These differences shall be used for division of labor alone "So that people can work for one another" (43/32). The economic disparity is to be taken care of thus:

"It is true that people vary in potential to earn the sustenance. But bad individuals take advantage of the unfair social system and keep to themselves,

as their personal possession, whatever bounty they get and do not return it to their sub-ordinates who stand in need of it. How can they misuse *Allah*'s bounty?" (16/17).

They should know that they on their own could never have obtained that wealth -- a combination of natural resources, social setup and other working men, have all contributed to it. "Allah's bounty is not your possession" (16/53). It is to be used for the poor and the needy as a matter of right (70/23-24).

Criterion for Respect

As to the question of social respect, the Quran founds it not on wealth, but, according to 'the permanent value system':

1. Each and every human being deserves respect just because of being human. (17/20).
2. Status in society depends upon one's input and personal character and qualities (6/133).
3. The one who upholds and follows *Allah*'s laws the best of all is the most respected one (49/13).

Therefore, the differences of capacity and ability do not affect individuals in the Quranic social system. It all happens because of unfair societies human beings create for themselves and erroneously blame it on Compulsion.

==========

FORGIVE ME PLEASE:

THIS RHETORIC OF "ISLAM ISLAM"

By

Aboo B. Rana

==========

It is said, behind every great man there has always been a great woman. It is hard for me to comment, how far I will go with that. Nonetheless, I do know for sure – "Behind the birth of every great man, there is always a mother." The people in general, because of the fear of *faux-pas,* social norms or conventions, have always repeated history's mistakes. It is always a great man who, once in a blue moon, comes along among us and changes the course of our history. It is actually to these men and women that we owe our respects, our inventions, discoveries and the blooming of life.

The topic that is disputed in the lines ahead, I may caution you, stinks like a skunk, and if anyone dares to involve himself into its details, it can become nerve wrecking, loathsome and offensive. It is not a subject likely to be taken as a *rara avis.* Though it will surely make Dr. Sigmund Freud's bones dance in jubilation in his grave, at the success of his theories. Before moving any further I shamelessly admit, being a lover of life (not unlived life), that I am not an admirer of any sort of onanism, be it mental or physical. Albeit, this monster has entered in almost every household and is being flushed out every single day, just like we flush our nature's calls in the toilets, every morning of our lives.

In the daily newspaper, "The Nation", on Tuesday August 24, 2004 there was this small news at the bottom of page 11 that read as follows:

"A row erupted on Monday over comments made by Muslim leaders in Malaysia that a husband could not be guilty of raping his wife." It further quoted the statement given by the State mufti that, "A husband has the right to be intimate with his wife and the wife must obey. If the wife refuses, then the rule of 'nusyuz' (disobedient) applies and the husband is not required to provide financial assistance to her."

Most of us, like the newspaper itself has done, will treat this matter as trivial and read on, while the younger generation may take it with crass sarcasm. Whatever the case may be, leaving aside the question of the lusts of a sex maniac, why this news threw me off balance and hit me like a bullet in the head, is the extent to which these muftis stoop low and cause havoc. Regardless, whether these muftis are from Malaysia,

Pakistan or Timbucktu. The first question that stares at every rational mind and commonsense, why a matter of sexual aberration is being connected with financial matters in marriage? Is the spreading of legs, whenever your husband desires, just for food and other necessities, the meaning of an Islamic marriage? If this is the case, then where lies the difference between a wife and a concubine, when they are both working for money at the beck and call of the man. The Islam these priests propagate is killing every living cell of the brain of the sane person in this world.

This is the kind of perverted version of Islam that I always slam. Being candid, I would rather prefer death than suffocate my freewill in such bull headed hypocrisy. Someone I know wisely said, 'There is no difference between us Muslims and the Hindus.' Maybe that is the basic cause we cannot settle our real issues. Our founding fathers were a superior breed. Leave alone the Hindu, they confronted bravely the whole world for the cause of their freedom, and created a new nation on the map of the world. Pathetically put, leave alone the moral progress, we have yet to learn how to live and let others live in freedom. Whether it is husband or wife, that partner is a lifeless person, who has no free will.

It is these chaotic situations which take from us our life's simple pleasures, when financial powers are granted to sex maniacs and sick minds by Islamic duffers. Indeed, this only brings out the shockingly inhuman and animal thoughts of a typical mufti state of mind. Whether it is muftism, mysticism, mullahism or any other Islamic schism. It is these schisms that are debilitating and enfeebling the attraction of the one and only true Islam. These schisms need to be bulldozed and rooted out, if we want to breathe fresh air. Another reason in this subcontinent is brides given in marriage are 'gift wrapped'. Apparently there is nothing wrong with that. Problems arise when brides are 'expensively gift wrapped,' because the monetary factor comes in overwhelmingly from the very first day of marriage.

Please do spare me! Not in my books have I read anywhere of these kinds of indictments. Call it lust, lunacy, animal passion or whatever you may like. Let us not give it the name of 'marriage.' Marital relationship, as most of us know, is a delicate flow of fragile communication of human emotions. In my unflinching belief, these sublime feelings may not be able to make a 'house' for every couple, and I also know, these sentiments can and certainly do make a 'home.' Someone can throw back a wise crack, as to how can two persons make a 'home' when they have no place to live? For that wise guy, I do have an answer; since that is a separate issue and needs more elaboration, better to stay with and solve the problem of wives first.

Gentlemen, I request forgiveness if the above lines left a nauseating odour. We have to, sometimes confront the real issues of life in the face and dissect them properly, in order to reach a cogent conclusion.

****